



ایزپورٹ سے اپنے کاغذات کی کلیئرنس حاصل کر کے میں بیسے ہی لاؤنج کے استقبالیہ صے کی جانب بڑھا، مٹھل بابا نے آگے بڑھ کر میرا بھاری بریف کیس پکڑا اور پھر اسے ایک طرف رکھتے ہوئے مجھے گلے سے لگالیا۔

”مٹھل بابا! یہ کیا ہو گیا... بابا سائیں کو کس نے قتل کر ڈالا۔ انہوں نے کسی کا کیا باڈا گڑا تھا...“ ان سے بات کرتے ہوئے میری آواز بندھ گئی۔

”حوصلہ رکھیں نادار سائیں۔ جس نے بھی یہ کیا ہے، اپنے انجام کو پہنچ کر رہے گا۔ ویسے اگر آپ میری رائے پوچھو تو مجھے شہباز کے علاوہ کوئی ایسا دشمن دکھائی نہیں دیتا جو اس حد تک جاسکے۔ ایک وہی ہے جو اس طرح کی سفایا کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔“

”نہیں مٹھل بابا، میں خواہ مخواہ کسی پر الزام نہیں لگا سکتا۔“ میں نے ان سے الگ ہو کر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی شہباز کی عمر ہی کیا ہے۔“

”وہ وڈیرا ہے چھوٹے سائیں! وڈیرا... ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک۔ اگر انسان کے پاس پیسہ اور طاقت ہو تو وہ چھوٹی عمر میں بھی بہت بڑی باتیں سوچنے لگ جاتا ہے۔ آپ اس کی عمر پر نہ جاؤ، بس یہ سوچو کہ وہ بھی آپ کے چاچا سائیں کا بیٹا ہے اور مرحوم سائیں گل باز سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف تھے۔ خون کا اثر ہے، خون کا اثر... گل باز سائیں بھی آپ کے والد کے خون کا پیاسا تھا اور اس کا بیٹا بھی آپ کے والد سردار سائیں کی جان لینا چاہتا تھا۔ سردار سائیں میرے سامنے بھی اس خدشے کا اظہار کر چکے تھے کہ انہیں شہباز کے تیور اپنے باپ سے زیادہ خطرناک لگتے ہیں۔ وہ آپ کے دادا کی آبائی زمین کے معاملے میں اپنے باپ سے بھی زیادہ لاپٹی اور حریص ہے۔ انہیں لگتا تھا کہ یہ کل کا لونڈا اپنے باپ سے زیادہ مکار ہے اور دیکھ لیں ان کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔“ مٹھل بابا نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”یہ جگہ ان باتوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”حویلی چل کر اس بارے میں مزید بات چیت ہوگی مگر ایک بات آپ بھی یاد رکھیں! میں بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے شہباز کا نام ایف آئی آر میں درج نہیں کروا سکتا۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ اگر وہ اس قتل میں ملوث نہ نکلا تو مجھے زندگی بھر پچھتاوا رہے گا۔ ہماری دشمنی پتلی جگہ مگر ہے تو وہ میرے سگے چچا کا بیٹا...“

کہتے ہوئے میں لاؤنج کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ مٹھل بابا نے اس بار خاموشی سے بھاری بریف کیس اٹھاتے ہوئے میری تقلید کی تاہم ان کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں تھے۔ میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ میرے بابا سائیں کے سب سے وفادار اور پرانے ملازم تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، انہیں اپنے بابا سائیں کے ساتھ ہی دیکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ میں بچپن سے ہی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ بابا سائیں بھی مٹھل بابا پر بہت اعتبار کرتے تھے۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے آدمیوں میں یہ واحد شخص ہے جو میری طرف بڑھنے والی گولی، سینہ تان کر اپنے سینے پہ کھانے کی ہمت رکھتا ہے۔ اگر کبھی نمک کا حق ادا کرنے کا موقع آیا تو مٹھل بابا ہی اپنا خون دے کر یہ حق ادا کرے گا، اس لئے اس نمک خوار کی ہمیشہ عزت کرنا۔ اس کی تین پشتیں ہمارے خاندان کی خدمت گزار اور وفادار رہی ہیں۔

میں مٹھل بابا کے بارے میں بابا سائیں کی رائے سے پوری طرح متفق تھا مگر شہباز کے بارے میں ان کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے آٹھ سال لندن میں گزارے تھے۔ اب میرے سوچنے کا انداز پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ میرے باپ کو بہت بھیمانہ اور سفاکانہ انداز میں قتل کیا گیا تھا۔ میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا خواہش مند ضرور تھا مگر دیگر وڈیریوں کی طرح خود مار کر نہیں بلکہ قانون کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے۔ مٹھل بابا ویسے تو میرے بابا سائیں کے ساتھ ہر وقت ہی ہوتے تھے مگر جس دن بابا سائیں کا قتل ہوا، وہ اپنی بیٹی کی شادی کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جاسکے تھے ورنہ شاید وہ بھی بابا سائیں کے ساتھ ہی اس دار فانی سے کوچ کر جاتے۔

بابا سائیں کا خیال آتے ہیں میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اگرچہ میرے باپ کا تعلق بھی سندھ کے انہی وڈیریوں کے خاندان سے تھا جن کے ظلم کی داستانوں پر پوری کتاب لکھی جاسکتی تھی تاہم میرے لئے بابا سائیں ہمیشہ ایک شفیق باپ ثابت ہوئے تھے۔ مجھے کبھی ان کی گفتگو سے احساس نہیں ہوا تھا کہ میں کسی وڈیرے سے بات کر رہا ہوں۔ بہر حال اب تو وہ اس دنیا میں ہی نہیں رہے تھے۔ تین دن قبل ان کو ان کے چار مسلح محافظوں سمیت اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ شہر سے ایک مقدمے کی پیروی کر کے اپنے گھر واپس آرہے تھے۔ حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ حملہ آوروں نے ان کی لینڈ کروزر پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی اور اتنی دیر تک گولیاں برسائی تھیں کہ گاڑی کو بالکل چھلنی کر ڈالا تھا۔ حملہ آور اس وقت تک گولیاں برساتے رہے تھے جب تک کہ انہیں تسلی نہیں ہو گئی تھی کہ اندر موجود تمام افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔

مجھے لندن میں اس خوفناک واقعہ کی اطلاع ملی تھی۔ اس خبر کو سن کر وقتی طور پر میں سکتے میں آ گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گویا ندھیرا سا چھا گیا تھا، تاہم میں نے خود کو سنبھالا اور واپسی کی سیٹ بک کروالی۔ مجھے تین دن بعد کی سیٹ ملی تھی، جس کی وجہ سے آنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اس دوران میں فون پر مٹھل بابا سے پوری طرح رابطہ میں رہا تھا۔ میرے والد اور ان کے گاڑی کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا، محافظوں کی لاشیں ان کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی تھیں اور ان کی تدفین بھی ہو چکی تھی جبکہ بابا سائیں کی لاش سرد خانے میں محفوظ تھی۔ ان کی تدفین اور ایف آئی آر کے اندراج کے لئے میری آمد کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا اور آج میں بھی پہنچ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں، میں مٹھل بابا کے ساتھ محو سفر تھا۔ میرے پیچھے ایک اور لینڈ کروزر بھی تھی، جس میں سات مسلح افراد ہماری حفاظت کے لئے موجود تھے۔ مٹھل بابا خود ڈرائیو کر رہے تھے جبکہ میں ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔ اس گاڑی میں ہم دونوں ہی تھے اور اب اپنے گھر واپس پہنچنے کے لئے مجھے تقریباً چار سے پانچ گھنٹے محو سفر رہنا تھا۔

”مٹھل بابا! اتنے مسلح گاڑی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی...؟“ میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”سائیں آپ کو گوٹھ کی صورت حال کا اندازہ نہیں ہے۔“ مٹھل بابا نے ناصحانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”جو لوگ آپ کے والد پر اس دیدہ دلیری سے حملہ کر سکتے ہیں، وہ آپ کے معاملے میں بھی رحم دل ثابت نہیں ہوں گے۔ ہمیں محتاط رہنا ہو گا اور گوٹھ میں بھی آپ زیادہ وقت حویلی میں رہیں تو بہتر ہو گا۔ آگے آپ ہمارے سائیں ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل بہر حال ہر صورت کی جائے گی کیونکہ اب آپ سردار سائیں کی جگہ لے چکے ہیں۔“

ان کی نصیحت سے صرف نظر میرے لئے بھی ممکن نہ تھا۔ اگرچہ میں ان کے شہباز پر الزام بارے متفق نہیں تھا مگر ان کی یہ بات تو درست تھی کہ جو لوگ میرے باپ کو نشانہ بنا سکتے تھے، وہ مجھ پر بھی حملہ کر سکتے تھے مگر بابا سائیں پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے...؟ میں سوچنے لگا۔

کیا واقعی شہباز اس حد تک جاسکتا تھا کہ اپنے سگے تایا کو قتل کروا دیتا اور ان کی جان لینے کی خاطر ان کے مسلح گاڑی کی بھی جان لینے سے نہ چوکتا... اتنی کم عمری میں کیا وہ اتنا سفاک ہو سکتا ہے؟ یہ درست تھا کہ وڈیریوں کی اکثر آپسی لڑائیاں زمین کی وجہ سے ہی شروع ہوتی ہیں اور بسا اوقات نسلوں تک جاری رہتی ہیں۔ عورتوں کے سہاگ اجڑ جاتے ہیں، بچے یتیم ہو جاتے ہیں، کئی نسلیں برباد ہو جاتی ہیں مگر وڈیرے اپنی آنا کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ اپنا سر کٹوانا تو گوارا کر لیتے ہیں مگر سر جھکانا کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کرتے۔

میرا باپ اور چچا بھی اگرچہ سگے بھائی تھے مگر زمین کے تنازعے اور دونوں کی آنا نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بننے پر مجبور کر دیا۔ میری والدہ اور چچی چاہتی تھیں کہ یہ لڑائی آگے نہ بڑھے۔ وہ دونوں بہت امن پسند خواتین تھیں۔ انہوں نے میرے والد اور چچا کے درمیان صلح کروانے کی بہت کوشش کی مگر شاید میرے والد اور چچا کی انا بہت بڑی تھی۔ میری والدہ اور چچی دونوں خاندانوں کو ایک کرنے کی خواہش اپنے ساتھ قبر میں ہی لے گئیں۔

میرے دادا کا نام ہاشم سائیں تھا اور ان کا شمار سندھ کے چند بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ میں نے ان کی صرف تصویر دیکھی تھی تاہم ان کے مظالم کے کئی قصے اپنے باپ سے سنتا آ رہا تھا، جو کہ قول میرے بابا سائیں، ظلم کے نہیں بلکہ بہادری کے قصے تھے۔ دادا سائیں اپنے مزارعوں اور گوٹھ کے سارے رہائشیوں کو اپنی رعایا سمجھتے تھے۔ بابا سائیں کے مطابق دادا سائیں اپنے مخالفین کو زندہ زمین میں دفن کروا دیا کرتے تھے۔ جب انگریزوں کا دور تھا تو انگریزوں کے بڑے بڑے افسران کے در پر حاضری دیا کرتے تھے۔

بابا سائیں میرے دادا کے مظالم کی داستان مجھے بڑے فخر سے سنایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک میرے دادا کے مظالم سرے سے مظالم ہی نہیں تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ دادا سائیں بالکل ٹھیک کرتے تھے۔ ہزاروں لوگوں پر اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لئے چند افراد کو عبرت ناک اور اذیت ناک موت مارنا ضروری تھا۔ اس طرح وہ چند، ان ہزاروں افراد کے لئے مثال بن جاتے تھے جو میرے دادا کے خلاف بغاوت کرنے کا سوچتے تھے۔ میرے دادا سائیں کے دو بیٹے تھے۔ ایک میرے والد جن کا نام دادا سائیں نے سردار رکھا تھا دوسرے میرے چچا، جن کا نام گل باز تھا۔ جب تک میرے دادا سائیں زندہ رہے، میرے بابا اور چچا بھی آپس میں اسی طرح رہے جس طرح سگے بھائی رہتے ہیں۔ میرے والد کی شادی چچا سائیں سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ انہوں نے پسند کی شادی کی تھی، اس لئے میرے دادا نے ان کی شادی جلدی کروادی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد میں پیدا ہوا تھا۔ میرا نام نادار رکھا گیا۔ یہ نام میرے دادا کا ہی تجویز کردہ تھا۔ میری پیدائش کے ایک ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادا کی موت کے بعد ان کی جگہ میرے والد کو مل گئی۔ اب وہ بڑے وڈیرے کا درجہ پا چکے تھے اور مٹھل بابا کے مطابق انہوں نے بھی خود کو ایک وڈیرہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کا سر کھنسنے کے سلسلے میں میرے دادا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اس زمانے میں پورے گوٹھ میں میرے باپ کی دہشت کا راج تھا۔ میرے چچا گل باز بھی اپنے بڑے بھائی سے دبتے تھے تاہم برسوں بعد جب ان کی شادی ہوئی اور ان کے ہاں شہباز کی پیدائش ہوئی تو میرے والد کے بارے میں ان کی سوچ میں تبدیلی آ گئی۔ انہیں لگنے لگا کہ بڑا بھائی زمینوں کے معاملے میں ان کی حق تلفی کر رہا ہے اور اس نے اپنے حصے سے زیادہ زمین اپنے نام کروالی ہے۔

میری ان معلومات کا ذریعہ مٹھل بابا تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے چچا کی سوچ میں کس حد تک صداقت یا حقیقت تھی، تاہم میں اپنے والد کی بھی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا تھا۔ بہر حال دادا جان کی موت کے بعد ان کے یہ دونوں بیٹے ایک ساتھ نہ رہ سکے۔ زمین کی ملکیت کا تنازع اتنی شدت اختیار گیا کہ بالآخر میرے چچا علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے جائیداد کا بھی ہٹوارہ کر لیا تاہم وہ اس ہٹوارے سے مطمئن کبھی نہیں ہوئے تھے۔ زمینوں کی وجہ سے جاری خصامت اب بڑھتے بڑھتے دشمنی کا روپ دھارنے لگی تھی۔ میرے والد اور چچا کے آدمیوں میں کئی مرتبہ فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا، جس میں کچھ آدمی ہلاک بھی ہوئے تھے۔

اس دوران میری والدہ اور چچی لگاتار کوشش کرتی رہیں کہ دونوں بھائیوں کے درمیان کسی طرح کوئی مفاہمت یا مصالحت ہو جائے۔ وہ دونوں اپنے شوہروں سے چھپ کر ملتی بھی رہتی تھیں۔ دونوں کی ملاقاتیں گوٹھ میں اپنی ایک مشترکہ سہیلی کے گھر پر ہوتی تھیں۔ شاید ان کی کوششیں رنگ لے آئیں اور میرے باپ اور چچا میں مصالحت کی کوئی راہ نکل آتی مگر میری والدہ کے اچانک انتقال سے یہ تیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور ٹھیک ایک برس بعد ہی چچی کے انتقال کی خبر بھی آ گئی۔ شاید انہیں اپنی دیرینہ سہیلی سے دوری برداشت نہیں تھی۔

والدہ کی وفات کے بعد بابا سائیں نے مجھے مٹھل بابا کے حوالے کر دیا اور یوں میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مجھے پہلی بار بدوق اور اسلحہ وغیرہ سے روشناس کروایا گیا۔ جب تک میری والدہ زندہ تھیں، اس وقت تک انہوں نے مجھے مٹھل بابا اور اسلحہ کے قریب بھی نہ پھلکنے دیا تھا۔ اس معاملے میں وہ بابا سائیں کے سامنے بھی ڈٹ جایا کرتی تھیں اور انہیں دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کرتی تھیں کہ وہ مجھے ان جیسا وڈیرا نہیں بننے دیں گی بلکہ وہ مجھے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنائیں گی جبکہ بابا سائیں کی سوچ میری والدہ کے بالکل برعکس تھی۔ وہ مجھے اپنے جیسا ایک وڈیرا دیکھنے کے ہی خواہش مند تھے اور وہ میری والدہ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ بیٹے کو چاہے ڈاکٹر بنالو مگر بالآخر اسے میری زمین ہی سنبھالنی ہے۔ دونوں کی بحث و تکرار اپنی جگہ تھی مگر جب تک میری والدہ زندہ رہیں، میں انہی کے زیر سایہ رہا اور ان کی تربیت کا بہت بڑا اثر آج بھی میرے اندر موجود تھا۔ وہ آٹھ سال جو میں نے اپنی ماں کے زیر سایہ گزارے تھے، میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھے اور شاید اسی وجہ سے میری سوچ مٹھل بابا بھی تبدیل نہیں کر پائے تھے۔ رہی سہی کثر لندن کی آٹھ سالہ زندگی نے نکال دی تھی۔

اگرچہ میری شہباز سے کبھی ملاقات تو نہیں ہوئی تھی تاہم مٹھل بابا کے توسط سے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تعلیم نے اس کی سوچ پر کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور کیا ہو گا۔ بہر حال میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے ملاقات کرواں گا اور برسوں سے جاری زمین کے تنازعے کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا، چاہے اس کے لئے مجھے اسے کچھ زیادہ زمین ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ میں تکبر کی اس لکیر کو مٹا دوں گا جو وڈیریوں نے اپنے ارد گرد کھینچ رکھی تھی۔ میں اپنے گوٹھ میں مزید کشت و خون نہیں چاہتا تھا۔ میرے باپ کے ساتھ جو مسلح محافظ مارے گئے تھے۔ اگرچہ میرے فون پر ہدایات دینے کے بعد مٹھل بابا نے ان کی مالی مدد کر دی تھی، تاہم مال سے کسی کی جان کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارے بس میرے باپ کی کسی دشمنی کی بھیٹ چڑھ گئے تھے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے وڈیرہ لفظ سے ہی چڑھو چکی تھی۔

(جاری ہے)

بچپن میں، میں اس لفظ کی خصوصیات سے ساید پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ میرے لئے یہ بس ایک نام یا لقب تھا مگر شعور کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ اس ایک لفظ کے پیچھے کسی کیسی خون آشام داستانیں چھپی ہیں۔

والدہ کی وفات کے بعد میں نے مٹھل بابا سے پہلی بار وڈیروں کے قصے سنے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ میرا باپ اپنے علاقے کا بادشاہ ہے اور میں اس کا جانشین ہوں، اس لئے مجھے ابھی سے بادشاہوں والے طور طریقے اپنانا ہوں گے۔ کمتر حیثیت کے افراد کو اپنے ساتھ نہیں بلکہ سامنے زمین پر بٹھانا ہے۔ عزت اسی کو دینی ہے جو عزت دینے کے قابل ہو۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ اگرچہ میں بہت چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اپنے آس پاس کے ماحول کے بارے میں سوچتا تھا۔ مجھے مٹھل بابا کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں تاہم مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ وہ مجھے وہی کچھ سکھائیں گے جس کا حکم انہیں میرے باپ کی جانب سے دیا جاتا تھا۔ مجھے بابا سائیں اور چچا جان کے آدمیوں کی آپسی فائرنگ اور ہلاکتوں کی خبر بھی مٹھل بابا کے توسط سے ملتی رہتی تھی۔ میری ہمیشہ یہ تمننا رہی کہ بابا سائیں اور چچا کی آپس میں صلح ہو جائے۔ یہ خواہش شاید میری مرحومہ ماں کی تربیت کا اثر تھا۔

بہر حال... تقریباً آٹھ برس پہلے میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن جانے کا فیصلہ کیا۔ میری مرحومہ ماں مجھے ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ میں ڈاکٹر تو نہیں بن سکتا، ہم میں نے ان کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب ضرور پورا کر دیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں پچھلے دو سال سے لندن میں جاب کر رہا تھا۔ سیلری اچھی تھی، اس لیے میں نے پیسوں کے لیے اب اپنے والد کو تکلیف دینا بھی چھوڑ دی تھی۔

بابا سائیں نے بہت کوشش کی کہ میں واپس آکر زمینی سنبھال لوں تاہم ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ میں ہر بار انہیں خوش اسلوبی سے ٹال دیتا تھا۔ مٹھل بابا کی تربیت کا مجھ پر جو توڑا بہت اثر ہوا تھا، لندن میں رہتے ہوئے وہ بھی زائل ہو چکا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں میرا بابا سائیں سے رابطہ صرف فون پر ہی رہا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی مٹھل بابا سے بات چیت ہو جاتی تھی، جن سے مجھے چچا اور بابا سائیں کے آدمیوں کے درمیان ہونے والے تازہ معرکوں کا پتا چلتا رہتا تھا۔ مٹھل بابا کی باتیں سن کر مجھے بڑا دکھ ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہلاک ہونے والے افراد کی یل آئی آر کسی غریب مزارے کے خلاف کاٹی جاتی تھی۔ وہ بیچارہ اس امید پر قتل کا جرم اپنے سر لے کر جیل چلا جاتا تھا کہ اس کے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری وڈیرے کے سپرد ہوتی ہے۔ اس معاملے میں میرے بابا سائیں بھی پوری ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جیل جانے والے افراد کے اہل خانہ کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے پاس قربانی کے ایسے بکروں کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی، جو ان کے ایک اشارے پر اپنی جان تک بچھا کر ڈالتے تھے۔

اگرچہ بابا سائیں اور چچا سائیں نے آپس کی لڑائیوں میں مرنے والے مزارعوں کے قتل کی ایف آئی آر میں کبھی ایک دوسرے کو نامزد نہیں کیا تھا، تاہم زمین کے تنازع کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا اور اس مقدمے کا بھی وہی حال تھا جو اس قسم کے دیوانی مقدمات کا عام طور پر ہوتا ہے۔ بابا سائیں کے وکیل عدالت میں پیش ہوتے رہتے تھے تاہم جس دن انہیں قتل کیا گیا اس دن انہیں عدالت میں گواہی کے لئے پیش ہونا تھا۔

چچا سائیں کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اب اس مقدمے کی پیروی شہباز کی جانب سے کی جا رہی تھی مگر پھر اچانک رونما ہونے والے اس سانحے نے پورا منظر نامہ ہی بدل ڈالا تھا اور مجھے لندن میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس لوٹنا پڑا تھا۔ موجودہ صورت حال میں ہر شخص کا ذہن شہباز کی جانب ہی جا رہا تھا اور مجھے یہی بات کھل رہی تھی۔ شہباز اگر واقعی وڈیروں والی ذہنیت رکھتا تھا تو موجودہ صورت حال میں بابا سائیں پر حملے کی بیوقوفی ہر گز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی صورت میں مورد الزام اُسے ہی ٹھہرا دیا جائے گا۔

گوٹھ تک پہنچنے میں پانچ گھنٹے لگے۔ راستے میں ٹریفک کا خاصا رش تھا، تاہم دیہاتی علاقے کی سڑک پر آتے ہی یہ رش چھٹ گیا۔ اب سڑک پر ٹریفک کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکاڈ گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ سڑک صاف دیکھتے ہوئے مٹھل بابا نے بھی خاصی تیز رفتاری سے گاڑی بھگانی شروع کر دی۔ گوٹھ کا علاقہ شروع ہوتے ہی وہ پوری طرح چوکنہ نظر آنے لگے تھے۔ ان کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ بادی النظر میں دیکھا جاتا تو ان کا مستعد ہو جانا غلط بھی نہ تھا۔ جس دشمن نے میرے باپ کو اس دیدہ دلیری سے نشانہ بنایا تھا، اس سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ابھی تک ہم اس دشمن کے بارے میں اندھیرے میں تھے۔ شہباز پر مٹھل بابا کو اگرچہ پورا شک بلکہ ایک حد تک یقین تھا تاہم میری سوچ مختلف تھی۔ بہر حال! اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت نے ہی کرنا تھا کہ وہ درست سمت میں سوچ رہے تھے یا نہیں!

پانچ گھنٹے کے طویل اور اکتا دینے والے سفر کے بعد ہم بخیر وعافیت حویلی پہنچ گئے۔ میں نے اپنی محل نما آبائی حویلی کا باہر سے نظارہ کیا۔ حویلی باہر سے ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں آٹھ برس کے دوران کوئی چھوٹی موٹی تبدیلی بھی نہیں کی گئی تھی۔ حویلی والوں کی سوچ میں تو شاید صدیاں گزرنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سندھ کے سبھی وڈیروں کی سوچ ایک تھی۔ دولت، طاقت اور اقتدار کا حصول۔ کچھ وڈیروں نے اس کے لئے اب سیاست کے میدان میں بھی چھلانگ لگا دی تھی، تاہم میرے بابا سائیں نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ کم از کم جب تک میں لندن نہیں گیا تھا اس وقت تو یہی صورت حال تھی اور فون پر بھی انہوں نے کبھی ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا جس سے مجھے یہ گمان ہوتا کہ وہ سیاست کے میدان میں اترنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

حویلی میں بس اب میری ماں اور باپ کی یادیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ ماں نے تو آٹھ سال کی عمر میں ہی الوداع کہہ دیا تھا اور اب باپ بھی ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا مگر مٹھل بابا کے سامنے نہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں ان کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دو یا تو وہ مجھے وہی درس دینا شروع کر دیں گے جو میں بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ پیٹا مرد نہیں روتے، یہ تو عورتوں کا کام ہے، وغیرہ وغیرہ، اس لئے میں نے مٹھل بابا کو کہا کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ فی الحال کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔

”جی بہتر... آپ کا کمرہ آراستہ کروا دیا گیا ہے۔ آج آپ آرام کر لیں، کل سردار سائیں کا جسد مل جائے گا اور کل ہی ان کی تدفین بھی کر دی جائے گی۔ پولیس ایف آئی آر درج کرچکے ناپا ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے ہی کافی دن گزر گئے ہیں۔ ایس پی سے بھی میری بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر نادر سائیں نے ایف آئی آر میں شہباز کا نام درج کر دیا تو پولیس اسے گرفتار کرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔“

مٹھل بابا کی تان پھر شہباز پر ہی آکر ٹوٹی تھی اور میں اس وقت ان سے بحث کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ حویلی آتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بابا سائیں اور ماں کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ دل کا غبار ہلکا کرنے کے لئے مجھے تنہائی درکار تھی، اس لئے میں مٹھل بابا کو الوداع کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔ اس رات مجھے بڑی دیر سے نیند آئی۔ اکیلے پن کا ایسا احساس آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت دیر تک میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہوتی رہی۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو رفتہ رفتہ نیند بھی آنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب ایک ملازم نے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ناشتہ لگنے کی اطلاع دی۔

میں نے شاہواریا اور پھر حویلی کے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ مٹھل بابا ناشتے کی ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے منع کرنے باوجود میں نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ ٹیبل پر بٹھا کر ساتھ ناشتہ کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے میری بات مان تولی تاہم ناشتے کے دوران بھی ان کے چہرے پر ایسے تاثرات موجود تھے جیسے انہیں میرے ساتھ بیٹھ کر یوں ناشتہ کرنا پسند نہیں آیا ہو۔ ناشتے کے بعد وہ اپنے دل کی بات زبان پر بھی لے آئے۔

”چھوٹے سائیں! ہمیں اتنی ہی عزت و جتنی کے ہم قابل ہیں۔ میں شاید اپنی زندگی میں پہلی بار آپ کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر رہا ہوں۔ بڑے سائیں زندہ ہوتے تو اس جسارت پر مجھے گولی مار دیتے...“

”مٹھل بابا! اب میرے سامنے وہی پرانی باتیں نہ شروع کر دیجیے گا جنہیں سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ میں لندن سے تعلیم حاصل کر کے لوٹا ہوں۔ مجھے ان دقیانوسی باتوں کا درس مت دیں۔“ میں نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”آپ کچھ عرصہ یہاں رہیں گے تو خود بخود سمجھ جائیں گے۔“ وہ ناصحانہ لہجے میں بولے۔ ”آپ کو ایک دن اندازہ ہو جائے گا کہ وڈیرے اور عام آدمی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وڈیرا اپنے علاقے کا بادشاہ کہلاتا ہے۔“

مجھے مٹھل بابا کے ان گھسے پنے جملوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم فی الحال میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا اس لئے میں نے خاموشی رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ”بابا سائیں کی باڈی آج کتنے بجے تک مل جائے گی اور تدفین کے لئے کیا انتظام کیا ہے؟ اب تو لوگ بھی آنا شروع ہو جائیں گے۔“

”تعزیت کے لیے تو کل شام سے ہی لوگ آنا شروع ہو گئے تھے تاہم میں نے آپ کے آرام کے پیش نظر کسی کو آپ سے ملنے نہیں دیا۔ ابھی ایک دو گھنٹوں تک لوگوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ حویلی کے وسیع و عریض میدان میں مردوں کے ٹھنڈے انتظام کر دیا ہے۔ عورتوں کے لئے بھی علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ آپ تیار ہیں، ہم کچھ دیر بعد ڈیڈ باڈی لینے روانہ ہو جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے جانے میں کچھ خطرات ہیں مگر سائیں کے بیٹے آپ ہیں، اس لئے باڈی بھی آپ کو ہی ملے گی۔“ مٹھل بابا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”پہلے دشمن کا پتا تو چلے، پھر ہی اس کی جرأت اور طاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔

”دشمن کا سب کو پتا ہے نادر سائیں، بس آپ کو یقین نہیں آرہا۔“ انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

میں ان کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر میری توجہ شہباز کی جانب مبذول کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید وہ ایف آئی آر میں شہباز کو نامزد کرنے کے خواہش مند تھے تاہم میں ان کے دلی جذبات کا احترام کرنے کے باوجود ان کی یہ خواہش پوری کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، ہم کچھ دیر میں روانہ ہوتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ بابا سائیں کی ڈیڈ باڈی ضروری کاغذی کارروائی کے بعد مل گئی۔ لاش لکڑی کے تابوت میں رکھی گئی تھی جس میں چہرے والے حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس جگہ سے میں بابا سائیں کا چہرہ دیکھ سکتا تھا مگر ایک دفعہ چہرہ دیکھنے کے بعد میں نے تابوت پر کپڑا ڈال دیا۔ میرے باپ کے چہرے پر اس قدر گولیاں لگیں تھیں کہ میں اس چہرے کے ساتھ انہیں پہچان ہی نہ سکتا تھا۔ بس گوشت کا ایک لو تھڑا تھا۔ بابا کی لاش کا چہرہ صرف چند لمحوں کے لئے ہی میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ لمحات میرے ذہن میں گویا جامد سے ہو گئے ہوں۔ میرے بابا جو کبھی اپنے

گوٹھ کے بادشاہ کہلاتے تھے، آج کس قدر بے چارگی سے تابوت میں بند تھے۔ موت انسان کی زندگی کی ایک ایسی اہل حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ انسان کی بادشاہت بس اتنی سی ہی ہے کہ زمین پر چند برس گزارنے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے۔ موت امیر غریب کا فرق ختم کر دیتی ہے، مرنے والے سے اس کا نام تک چھین لیتی ہے۔ قبر میں دفناتے وقت یہ کہا جاتا ہے کہ میت کو لے آؤ، نام نہیں پکارا جاتا۔ امیر ہو یا غریب، سب کا ایک ہی نام ہوتا ہے ”میت“۔

اگرچہ غالب گمان یہی تھا کہ جو میرے بابا سائیں کے دشمن تھے۔ وہ مجھ پر بھی حملہ کر سکتے تھے تاہم یہ لازم بھی نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ قاتلوں کو صرف میرے باپ سے ہی پُر خاش ہو اور بابا سائیں سے انتقام لینے کے بعد مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہو سکتا تھا کہ بابا سائیں کا برسوں پہلے کیا گیا کوئی ظلم ان کے سامنے مکافات عمل بن کر آگیا ہو، کسی نے کوئی پرانا حساب چمکا دیا ہو...؟ یا پھر مٹھل بابا کی بات درست تھی کہ اس کے پیچھے شہباز کا ہی ہاتھ ہو۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے کہ میں شہباز کو کل کا لونڈا نہ سمجھوں۔ وہ وڈیرا تھا اور اب اپنے باپ کی گدی پر بیٹھ چکا تھا۔ دولت، طاقت اور اختیار کے گھمنڈ میں بسا اوقات انسان ایسے ایسے اقدامات اٹھالتا ہے جن کا شاید کوئی عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بابا سائیں کی لاش لے کر جب ہم اپنی حویلی پہنچے تو باہر تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ چکا تھا۔ ”نادر سائیں! بہتر ہے کہ آپ تعزیت کرنے والوں کی بھیڑ سے دور رہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ان میں کون دوست ہے اور کون دشمن... میں تعزیت کے لیے آنے والوں میں جو صاحب حیثیت افراد ہیں، ان کی آپ سے علیحدہ ملاقات کا بندوبست کرتا ہوں۔ آپ ان سے ڈرائنگ روم میں مل لیجیے گا۔“ گاڑی سے اترتے ہی مٹھل بابا نے کہا۔

(جاری ہے)

”بابا! آج میرے باپ کا جنازہ ہے۔ میں اس طرح کروں گا لوگوں کو نہیں گئے کہ وہ میرے سردار کا بیٹا بڑول ہے۔ یہ درست ہے کہ مجھے کچھ خطرات لاحق ہو سکتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میں کسی چوہے کی طرح گھر میں دبک کر بیٹھ جاؤں۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ آپ تدفین کی تیاری کریں، میری فکر چھوڑیں۔“ میں نے ناصحانہ لہجے میں انہیں جواب دیا اور گاڑی سے نکل کر بے دھڑک ان افراد کی جانب بڑھ گیا جو نہ جانے کہاں کہاں سے میرے والد کے جنازے میں شرکت کے غرض سے آئے ہوئے تھے۔ میں ان میں سے بہت کم افراد کو جانتا تھا، اس کے باوجود وہ سب میرے لیے قابل احترام تھے۔

لوگوں نے مجھ سے تعزیت کرنی شروع کر دی۔ ایسے میں مٹھل بابا چار مسلح آدمیوں کے ہمراہ کسی جن کی طرح مسلسل میرے ساتھ موجود تھے۔ مجھے ان کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ میرے بارے میں دشمن کے کسی متوقع حملے کے پیش نظر پوری احتیاط کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے آگاہ کیا گیا کہ خاندانی قبرستان میں بابا سائیں کی قبر تیار کر دی گئی ہے۔ ہمارا خاندانی قبرستان اس حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے میں بھی دوسرے افراد کے ساتھ جنازے کے ہمراہ پیدل وہاں تک گیا۔ بابا سائیں کو جب لحد میں اتارا جا رہا تھا تو میرے ضبط کے تمام بندھن ایک بار پھر ٹوٹ گئے۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ بابا سائیں کی قبر کے ساتھ ہی میری والدہ کی قبر موجود تھی اور کچھ ہی فاصلے پر مرحوم چچا اور چچی کی قبریں بھی تھیں۔ میں حالات کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا۔ میرا باپ اور چچا ساری زندگی جس زمین کی خاطر لڑتے رہے آج اسی زمین میں یکجا ہو گئے تھے۔ زندہ رہے تو ساتھ رہنے پر تیار نہیں تھے مگر مرنے کے بعد ایک ساتھ دفن ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی ہر شے کا ہٹوارہ کر لیا تھا مگر اس آبا کی قبرستان کا ہٹوارہ نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دوری پر میرے دادا وڈیرے ہاشم کی قبر تھی۔ چچا اور بابا کی موت میں بس دو سال کا ہی وقفہ تھا۔ ہاں یہ فرق ضرور تھا کہ چچا کی موت طبعی تھی جبکہ میرے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ ان کے قاتل ابھی زندہ تھے اور شاید بابا کے بعد میری جان کے درپے بھی تھے۔

تدفین کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ سب کچھ بخیر و عافیت ہو گیا۔ تدفین کے بعد بہت سے افراد مجھ سے تعزیت کر کے وہیں سے رخصت ہو گئے جبکہ کچھ میرے ساتھ حویلی تک واپس بھی آئے۔ شام سے پہلے تعزیت کرنے والے تقریباً تمام افراد رخصت ہو گئے تھے۔ میں بھی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ مٹھل بابا نے علاقہ ایس پی کی آمد اطلاع دی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید میں انکار کر دیتا مگر علاقہ ایس پی میرے والد کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں آیا تھا اور میں اس سلسلے میں پولیس سے پورا تعاون کرنے کا خواہاں تھا۔

ایس پی کا نام سراج خان تھا۔ جب میں اس سے ملا تو اسے اپنے توقع کے بالکل برعکس پایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام روایتی پولیس افسروں کی طرح کوئی خراش اور قدرے زیادہ عمر کا شخص ہوگا مگر میری سوچ کے برعکس وہ میری عمر کا ہی ایک نوجوان تھا۔ شاید وہ سی ایس پی افسر تھا۔ بہر حال مجھے اپنے گوتھ میں تعینات ایک نوجوان افسر کو دیکھ کر اچھا لگا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ گرمجوش مصافحے کے بعد ہم دونوں صوفوں پر آٹھ سائے بیٹھ گئے جبکہ مٹھل بابا خاموشی سے ایک جانب کھڑے ہو گئے۔

”نادر سائیں مجھے آپ کے دکھ کا اندازہ ہے۔ میں آپ کو آج تدفین کے دن تکلیف دینے پر معذرت چاہتا ہوں مگر آپ سمجھدار ہیں، ہماری مجبوری سمجھتے ہیں۔ ایف آئی آر میں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے، اب مزید تاخیر مناسب نہیں ہے۔“ سراج خان کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی باوقار تھی۔

”جی ایس پی صاحب! میں ان باتوں کو سمجھتا ہوں۔ آپ جس طرح چاہتے ہیں کریں۔ کیا مجھے ایف آئی آر کے اندراج کے لیے پولیس اسٹیشن جانا پڑے گا؟ اگر ایسا ہے تو پھر کل کا کوئی وقت دے دیں، آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ میں نے نرم اور ملتی لہجے میں کہا۔

”پولیس اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سراج خان مصالحت آمیز لہجے میں بولا۔ ”میرے آدمی باہر ایف آئی آر رجسٹرڈ کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ کی اجازت ہو تو ان میں سے کسی کو اندر بلا لیتا ہوں۔ اندراج آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ مجھے آئی جی صاحب کو رپورٹ دینی ہے۔“

”مٹھل بابا باہر ان کا جو آدمی موجود ہے، اسے اندر لے آئیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

”مٹھل بابا کہنا ہے کہ یہ قتل وڈیرے شہباز نے کروایا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی بات سے متفق ہیں تو اس کا نام ایف آئی آر میں درج کروادیں، میں اسے فوراً گرفتار کروں گا۔“ ایس پی سراج خان نے کہا۔ ”وہ بہت بار سوخ ہے، نام کے اندراج کے بغیر میرے لیے اسے گرفتار کرنا مشکل ہوگا۔“

”آپ مٹھل بابا کو رہنے دیں، میں خواہ مخوہ شہباز کا نام اس پرچے میں نہیں دینا چاہتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر یہ صرف مٹھل بابا کی بات نہیں، پولیس کو بھی اسی پر شک ہے۔ آپ کی خاندانی دشمنی اسی کے ساتھ ہے۔ جس دن آپ کے بابا سائیں کو قتل کیا گیا، اُس دن بھی وہ اس مقدمے کے سلسلے میں عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کروا کر واپس آ رہے تھے، جو آپ کے مرحوم چچا نے ان کے خلاف دائر کر رکھا تھا۔ آپ کے چچا کی موت کے بعد ان کے بیٹے شہباز نے اس کیس کی پیروی کو جاری رکھا ہے۔“ سراج خان پر خیال لہجے میں بولا۔

”یہ ساری باتیں میرے علم میں ہیں ایس پی صاحب۔“ میں نے تقیبی لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ مقدمہ تو کئی برسوں سے عدالت میں زیر سماعت ہے۔ شہباز نے اگر اس کی پیروی جاری رکھی ہے، تو یہ اس کا قانونی حق ہے۔ صرف اس لیے کہ اس نے اپنے باپ کے مقدمے کی پیروی جاری رکھی ہے، اسے مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر آپ کے پاس اُس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو بتائیں؟“

”ہمیں ابھی صرف اس پر شک ہے۔ فی الحال مجھے پے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس کی وجہ سے میں اسے مجرم قرار دے سکوں۔ ہمیں ابھی ثبوت تلاش کرنے ہیں جن افراد نے آپ کے والد کو قتل کیا ہے، ابھی تک ہم ان کے بارے میں اندھیرے میں ہیں۔ ہمارے مخبر کام پر لگے ہوئے ہیں مگر ابھی تک ہمیں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ تاہم اگر آپ کسی پر شک ظاہر کرتے ہوئے اس کا نام ایف آئی آر میں درج کروادیتے تو ہماری تفتیش کا ایک رخ متعین ہو جاتا۔ ہماری تفتیش شک کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے۔“ سراج خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”معذرت کے ساتھ ایس پی صاحب، میں صرف آپ کی تفتیش کو کوئی رخ دینے کے لئے کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو شہباز کو اس قتل سے براہ راست کوئی فائدہ نہیں ہونے والا، وہ ہماری جائیداد کا وارث بھی بن سکتا ہے جب وہ مجھے بھی راستے سے ہٹا دے اور یہ فائدہ بھی اسے اسی وقت ہوگا جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی۔“ میں نے سراج خان کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ کی دلیل میں وزن ہے۔“ سراج خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ کے بابا کے قتل میں شہباز ملوث ہے تو پھر اس کا مقصد بھی پورا ہوگا جب وہ آپ کو بھی راستے سے ہٹا دے۔ اس کے بعد آپ کی جائیداد حاصل کرنے میں اس پر کوئی قانونی قدغن نہیں رہ جاتی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ واقعی ہی اس کھیل میں ملوث ہے تو پھر جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ سردار سائیں کے قتل پر پولیس پہلے ہی اس پر شک کر رہی ہے اور ایسی سچویشن میں وہ فوری طور پر کوئی سنگین اقدام اٹھانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اگرچہ ابھی مشکوک افراد کی لسٹ میں میرے پاس واحد نام اسی کا ہے اور ہمیں صرف اسی پر شک ہے، تاہم اگر ہمارا شک درست ہے تو پھر آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ وہ آپ پر وار ضرور کرے گا۔“

”میں اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہوں گا مگر آپ کے محتاط رہنے والے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے مٹھل بابا ایک پولیس والے کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا رجسٹرڈ تھا۔

میں اپنے ملک اور لندن کی پولیس کا دل ہی دل میں موازنہ کرنے لگا۔ اگر یہی واقعہ لندن میں پیش آتا تو لواحقین کو کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی کہ پولیس قاتلوں کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ لندن پولیس شاید پاتال سے بھی قاتلوں کو تلاش کر لیتی مگر یہاں تو بابا سائیں کی موت کے بعد میری زندگی کو بھی خطرات لاحق تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے کے لئے رجسٹر لے کر میرے گھر آنے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اتنے افراد کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ یقیناً ایک ہائی پروفائل کیس تھا مگر اگر لڑائی جھگڑے کا کوئی عام کیس بھی ہوتا تو شاید پولیس والے پھر بھی خود ہی میرے گھر آتے کیونکہ میں ایک وڈیر تھا۔

دوسری طرف اسی گوتھ کا ایک طبقہ تھا جسے پرچہ درج کروانے کے لئے تھانوں میں کئی کئی دن تک دھکے کھانے پڑتے تھے اور بسا اوقات پولیس مخالف پارٹی سے مل کر مدعی کو ہی رگڑا لگادیتی تھی جس معاشرے میں انصاف کا توازن اس طرح بگڑ چکا ہو، وہاں پولیس سے زیادہ امیدیں وابستہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ اب میں لندن میں نہیں ہوں تاہم پھر بھی ایک موبوم سی امید تھی کہ شاید ان آٹھ سالوں میں تھانہ کلچر میں کچھ تبدیلی آگئی ہو۔ کم از کم سراج خان جیسے پڑھے لکھے آدمی کو دیکھ کر کچھ امید کی جاسکتی تھی مگر وہ بھی اسی سسٹم کا حصہ تھا ورنہ رجسٹر میرے گھر لانے کی بجائے مجھے تھانے میں طلب کرتا۔

میری مدعیت میں بالآخر مقدمہ درج ہو گیا۔ مٹھل بابا نے آخری وقت میں بھی مجھے شہباز کا نام دینے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی مگر میرا فیصلہ اٹل تھا۔ میں نے ایف آئی آر نامعلوم افراد کے خلاف ہی درج کروائی۔ میرے دستخط لینے کے بعد ایس پی سراج خان وہاں سے رخصت ہو گیا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اگلے دو تین دن بھی اسی طرح گزرے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا اور میں مٹھل بابا کی تمام نصیحتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر آنے والے سے ملاقات کرتا رہا۔ تین دن بعد لوگوں کی آمد کا سلسلہ تھما تو میں نے زمینوں کے معاملات دیکھنے شروع کر دیے۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے خالی حویلی کاٹنے کو دوڑنی تھی، ماں اور بابا سائیں کی یادیں الگ سے تنگ کرتی تھیں، اسی وجہ سے میں نے خود کو زمین کے معاملات میں مصروف کر لیا تھا۔ میں کئی بار مٹھل بابا اور اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ اپنی زمینوں پر گیا۔ انہوں نے مجھے وہ زمین بھی دکھائی جس کی وجہ سے میرے باپ اور چچا کے درمیان دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔ اس زمین پر قبضہ میرے والد کا ہی تھا تاہم بہ قول مٹھل بابا، کبھی کبھی میرے والد اور چچا کے آدمیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ چچا آخری وقت تک اس زمین پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تھے اور اب مٹھل بابا ہی کے مطابق شہباز اس زمین کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

میں نے شہباز کو بچپن میں دیکھا تھا نہ جوانی میں کبھی اُس سے سامنا ہوا، تاہم دل میں اس سے ملاقات کی خواہش ضرور تھی۔ مجھے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اس نے میرے والد کی وفات پر بھی مجھ سے تعزیت نہیں کی تھی۔ اگر دشمنی کی وجہ سے خود نہیں آسکتا تھا تو کم از کم کسی کے ہاتھ ایک تعزیتی پیغام ہی بھیج دیتا۔ بہر حال اس سے ملاقات کی خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان دنوں موبائل فون نہیں ہوتے تھے اور ہمارے گوتھ میں تو بالکل نہیں۔ حویلی کے ڈرائنگ روم میں وہ اکلوتا فون موجود تھا جس سے میں ضروری فون وغیرہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی لندن کے کچھ دوستوں سے گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔ ڈرائنگ روم میں حویلی کے ملازموں اور مٹھل بابا کی آمد و رفت جاری رہتی تھی، اس لیے میں نے فون اپنے کمرے میں شفٹ کر لیا تھا۔ ایک دن جب میں اپنے کمرے میں کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا تو فون کی گھنٹی نے میرا انہماک توڑ دیا۔

”ہیلو!“ میں نے ریسپور کریڈل سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیا میری بات وڈیرے نادر سے ہو سکتی ہے؟“ دوسری طرف سے ایک اجنبی شائستہ مرد آواز سنائی دی۔

”نادر ہی بول رہا ہوں۔ فرمائیے!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”نادر سائیں! یہ آپ ہو... مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ دوسری طرف سے مسرت بھرے لہجے میں کہا گیا اور میں بے اختیار چونک پڑا۔

(جاری ہے)

قسط: 2

شاكر لطيف



”آپ کون ہیں؟ معاف کیجیے گا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔“ میں نے اسٹھسار کیا۔ ظاہر ہے فون پر محض آواز سے میں کسی کو کیسے پہچان سکتا تھا۔

”ارے بچانوں گے کیسے نادر سائیں! ہم کبھی ملے ہی نہیں مگر... نہ ملنے سے خون کے رشتے تو ختم نہیں ہو جاتے۔“

اب کسی مغالطے یا غلط فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ ”شہباز یہ تم ہو... تم نے مجھے فون کیا ہے...! اب تو تمہارے تایا سائیں بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور ایسی بھی کیا دشمنی تھی کہ تم ان کے جنازے پر ہی نہ آئے...!“ میں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

”مجھے تایا سائیں کے بے رحمانہ قتل کا بے حد افسوس ہے۔“ وہ متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ”میں آج ان کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر آیا ہوں۔“

”قبر پر چلے گئے مگر جنازے میں شرکت کرنے نہیں آئے...“ میں نے شکوہ کیا۔

”ہیں تو آنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آدمی کے ذریعے پیغام بھی بھجوایا تھا کہ دشمنی اپنی جگہ، مگر مجھے تایا کے جنازے میں شرکت کی اجازت دی جائے۔“ شہباز نے کہا۔

”تمہارا تو کوئی آدمی حویلی نہیں آیا!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ سے تو وہ تبھی ملتا جب مٹھل بابا اُسے آپ تک پہنچنے دیتے۔ انہوں نے اسے باہر سے ہی چلتا کر دیا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ شہباز سے کہہ دینا کہ اگر وہ ادھر آیا تو اس کا استقبال گولیوں کی برسات سے کیا جائے گا۔ آپ خود بتادیں کہ اس جواب کے بعد میں کیسے آتا؟ جس دشمنی کو ختم کرنے کی خواہش اپنے دل میں لیے ہماری مائیں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور جس کو ختم کرنا میری اپنی زندگی کی بھی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اگر میری وہاں آمد سے اس دشمنی کو بڑھا واملتا تو پھر میرا نہ آنا ہی بہتر تھا۔“ شہباز کے جواب نے مجھے وقتی طور پر سششدہ کر دیا۔

یہ درست تھا کہ اس حویلی میں مٹھل بابا کی حیثیت عام ملازمین سے بہت الگ تھی۔ میں انہیں ایک بزرگ کا درجہ بھی دیتا تھا مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ میرے خاندانی معاملات کے فیصلے بالا بالا ہی کرنے لگیں۔

مجھے مٹھل بابا کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔ شہباز نے فون کر کے میرا دل جیت لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عام وڈیروں کی طرح ان پڑست نہیں تھا ورنہ مجھے کبھی فون نہ کرتا۔ اس کی کال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی مرحومہ چچی کی طرح مصالحانہ اور نرم طبیعت کا مالک تھا۔ شاید ہم دونوں پر ہی اپنے باپ کی بجائے ماؤں کے خون کا یادہ اثر ہوا تھا۔

”میں مٹھل بابا کی اس حرکت پر بے حد شرمندہ ہوں شہباز اور تم سے دلی طور پر معذرت بھی چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے تایا جان کی تدفین میں شرکت کا پورا حق تھا۔ یقین کرو مجھ سے تمہارے بھیجے ہوئے کسی آدمی کی ملاقات نہیں ہو سکی۔“ میں نے تقہیبی لہجے میں کہا۔

”مجھے اندازہ تھا کہ یہ بات آپ کہ علم میں نہیں ہوگی، اسی وجہ سے میں نے آپ کو براہ راست فون کیا ہے۔ آپ کا فون نمبر بھی ایک وڈیرے سے ملا ہے ورنہ میرے پاس آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔“ شہباز نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو فون کر دیا، اس طرح بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی بات درست ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تایا جان کے قتل کے سلسلے میں مٹھل بابا نے آپ سے میرا ہی نام لیا ہو گا مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا تایا جان کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ میں جانتا ہوں کہ انہیں کس نے قتل کیا ہے۔ آپ نے ایف آئی آر میں میرا نام نہیں دیا۔ آپ کے اس اقدام سے میرے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ گئی ہے۔“

”تمہارا بھی بہت شکریہ! تمہارے فون سے مجھے سو فیصد یقین ہو گیا ہے کہ بابا سائیں کے قتل میں تم ملوث نہیں ہو اور میرا تمہارا ایف آئی آر میں نام نہ دینا بالکل درست فیصلہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس دشمنی کو مزید بڑھنے نہیں دینا چاہیے۔ ماضی میں جو ہوا، ہو چکا، اب مزید کسی انسان کا خون نہیں بہے گا۔ آخر مزار سے بھی تو انسان ہیں... وہ کب تک ہم وڈیروں کی خاطر قربان ہوتے رہیں گے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ کی باتوں نے میرا دل جیت لیا ہے نادر سائیں۔“ شہباز نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ”یقین جانے! میں خود اس قسم کی دشمنی سے نفرت کرتا ہوں جو اپنوں سے دور کر دے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ تایا سائیں کی تعزیت کرنے کے ساتھ ساتھ میں آپ سے دشمنی بھی ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے تمہاری باتیں سن کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری سوچ بالکل ایک جیسی ہے۔ تم کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ حویلی میں کھاؤ گے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا۔

میں تو آنا چاہتا ہوں نادر سائیں، مگر آپ کے وہ مٹھل بابا مجھے دیکھتے ہی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ایک دودفعہ میرا عدالت میں بھی ان سے آمناسنا ہوا وہ مجھے دیکھ کر مغفلات اگلنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو نظر انداز کیا ہے ورنہ میرے آدمی کئی مرتبہ ان کی باتوں پر مشتعل ہو کر ان پر گولی چلانے کا ارادہ کر بیٹھے تھے۔ کل میری آمد پر بھی انہوں نے ایسا ہی رویہ روار کھا تو میں اپنے آدمیوں میں سے کسی کی گارنٹی نہیں دے سکوں گا۔ یہ مت سمجھیے گا کہ میں کسی قسم کی دھمکی دے رہا ہوں، بس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے مسلح گارڈز کی بھی عزت نفس ہے اور براہ راست گالی دینے پر کوئی بھی مشتعل ہو سکتا ہے۔“ شہباز نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”یہ حویلی میری ہے، مٹھل بابا کی نہیں...“ میں نے جواب دیا۔ ”مٹھل بابا اگرچہ پرانے ملازم ہونے کے ناتے میرے لیے قابل احترام ہیں مگر اب انہیں سمجھنا ہو گا کہ خاندانی دشمنی نام کی یہ منطق پرانی ہو چکی ہے۔ تم کل آ جاؤ، مٹھل بابا کی طرف سے میں ضمانت دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اپنے بڑے بھائی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کل آ جاؤں گا پھر بیٹھ کر باقی باتیں ہوں گی۔ میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے اور آپ نے ایف آئی آر میں میرا نام نہ دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ میں نے آپ کے بارے میں جیسا سوچا تھا، آپ ویسے ہی ہیں۔ تو پھر کل دوپہر کے کھانے تک کے لیے اجازت دیجیے۔ خدا نگہبان۔“ یہ کہتے ہوئے شہباز نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے فون کر پڈل پر رکھ دیا۔

مجھے شہباز سے بات کر کے اور اس کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس پورے گٹھ میں میرا واحد قریبی رشتہ دار تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں ان تمام تنازعات کو ختم کر ڈالوں گا جن کی وجہ سے ہمارے بڑوں نے اپنے اپنے راستے جدا کر لیے تھے تاہم اب مٹھل بابا سے دو ٹوک بات کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر انہوں نے اس معاملے میں زیادہ مداخلت کی تو پھر میں انہیں سخت لہجے میں سمجھاؤں گا۔ بزرگ اور قابل احترام ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ میں انہیں کھلی من مانی کرنے کی اجازت دے دیتا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں ایک ملازم موجود تھا۔ میں اس کے اصل نام سے تو لاعلم تھا۔ سب اسے شرفو کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ میں نے بھی اسے اسی نام سے پکارا۔

”جی سائیں!“ میرے پکارنے پر وہ اس قدر مستعدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا کہ میں اُس کی اس حرکت پر بے اختیار مسکرا دیا۔

”مٹھل بابا کپتا کرو۔ وہ جہاں بھی ہیں انہیں پیغام دو کہ میں فوری طور پر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جی بہتر سائیں۔“ شرفو نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا اور تھوپی بے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

مٹھل بابا زیادہ تر حویلی میں ہی موجود رہتے تھے تاہم آج صبح ناشتے کے وقت انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہے ہیں، دو تین گھنٹوں تک واپس آ جائیں گے۔ میں نے ان کی بات کا کوئی جواب تو نہیں دیا تھا، تاہم میں جانتا تھا کہ وہ میری خاموشی کو میری رضامندی ہی سمجھ رہے ہوں گے، ویسے بھی ان پر حویلی کے دوسرے ملازمین کی طرح اوقات کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے چلے جاتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ اپنا زیادہ وقت حویلی میں ہی گزارتے تھے اور جب سے میں آیا تھا وہ رات کو بھی حویلی میں موجود رہتے تھے۔ حویلی میں ان کے لیے دوسرے ملازمین سے علیحدہ ایک کمر، بابا سائیں کے زمانے سے ہی مختص تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ آج کل وہ اپنا زیادہ تر وقت حویلی میں ہی کیوں گزارنے لگے ہیں؟ انہوں نے میری والدہ کی وفات کے بعد مجھے بڑی محبت سے پالا تھا۔ وہ مجھے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی صرف سیٹیاں تھیں، کوئی بیٹا نہ تھا اور شاید اسی لیے بیٹی کی جگہ انہوں نے مجھے دے رکھی تھی تاہم ان کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ مؤدبانہ رہتا تھا۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ نادر سائیں کہہ کر پکارا تھا۔ کبھی بیٹا کہنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے دلی جذبات کو حویلی کے رواج کے سامنے چل ڈالنے کے عادی تھے۔ میں بھی ان کی تہہ دل سے عزت کرتا تھا مگر آج مجھے ان پر ہلکا سا غصہ آ رہا تھا۔ میرے خیال میں انہیں شہباز کا پیغام لانے والے آدمی کو مجھ سے پوچھنے بغیر واپس نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مجھے ان کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں وہ آ گئے۔

”کیا بات تھی نادر سائیں...! شرفو کہہ رہا تھا کہ آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔“ مٹھل بابا نے اندر داخل ہوتے ہی سوال کیا۔ وہ میرے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق صوفے پر بیٹھنے سے گریز کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے ذہن سے بابا سائیں کے زمانے کے رواج اتنی آسانی سے نہیں نکلنے والے تھے۔

”مٹھل بابا! بیٹھ کر بات کریں۔ میں نے آپ کو کئی مرتبہ کہا ہے کہ مجھے بابا سائیں کی طرح ٹریٹ نہ کیا کریں۔“ میں نے انہیں کھڑے دیکھ کر کہا۔ میری بات پر ان کے چہرے پر ہلکے سے تذبذب کے تاثرات آئے تاہم وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ”مٹھل بابا! میری آج شہباز سے فون پر بات ہوئی ہے۔“ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

انہوں نے چونک کر میرے طرف دیکھا۔ شہباز کا نام سن کر ان کے چہرے پر ہلکے سے غصے کے تاثرات عود آئے تھے تاہم انہوں نے فوری طور پر کچھ بولنے سے گریز کیا۔

”آج شہباز نے مجھے فون کیا تھا۔ اس نے قسم کھا کر مجھے یقین دہانی کروائی ہے کہ بابا سائیں کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”اور میرے بھولے سائیں نے فوراً اُس کی قسم پر یقین کر لیا...؟“ مٹھل بابا نے شاید پہلی بار مجھ سے بات کرتے ہوئے طنزیہ لہجہ اختیار کیا تھا تاہم مجھے ان کا یہ انداز برا نہیں لگا۔ میں شہباز بارے ان کے تحفظات سے بخوبی آگاہ تھا۔

”مٹھل بابا! میں آپ کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آپ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آپ ذہنی طور پر اُسے قاتل تسلیم کر چکے ہیں، اسی لیے اُس کے بارے میں اس طرح سوچ رہے ہیں۔ ذرا کچھ دیر کے لیے اس کی نفرت کو دل سے نکال کر سوچیں۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”یہی مشورہ میں آپ کو دینا چاہوں گا نادر سائیں۔ آپ بھی کچھ دیر کے لیے اس کی محبت دل سے نکال کر سوچیں۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ سردار سائیں کے قتل میں شہباز ہی ملوث ہے۔ وہ سردار سائیں کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولے۔

”مٹھل بابا! سردار سائیں کی دولت کا وارث میں ہوں اور میں ابھی زندہ ہوں۔ اگر وہ واقعی میری زمین پر قبضہ جمانا چاہتا ہے تو اس نے ابھی تک مجھ پر حملہ کیوں نہیں کروایا...؟“ میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

”وہ احمق نہیں ہے نادر سائیں! اپنے باپ سے زیادہ سیانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ابھی سردار سائیں کے قتل کا واقعہ تازہ ہے۔ پولیس کو بھی اُس پر شک ہے۔ اگر اس وقت اُس نے آپ کو قتل کروایا تو پولیس اسے گرفتار کرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ ایس پی سراج خان سے میرے بات ہوئی ہے۔ اسے بھی شہباز پر شک ہے مگر کیونکہ آپ نے اس کا نام ایف آئی آر میں نہیں دیا اس لیے وہ اسے گرفتار نہ کرنے پر مجبور ہے۔ اگر آپ شہباز کا نام دے دیتے تو وہ پولیس کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر پاتا، اب تک سب کچھ اگل دیتا...“

”مٹھل بابا، آپ پولیس کو تو رہنے ہی دیں۔ یہاں کی پولیس تو شیر سے یہ اعتراف کروا لیتی ہے کہ وہ بکری ہے، کسی بے گناہ سے اعتراف جرم کروانا ان کے لیے کون سا مشکل کام ہے۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”کوئی کسی کو یوں ہی نہیں مار دیتا نادر سائیں۔“ مٹھل بابا ناصحانہ لہجے میں بولے۔ ”کسی کو قتل کرنے کے پیچھے ٹھوس وجہ اور محرکات ہوتے ہیں۔ دشمنی، لالچ یا عداوت... اور آپ کے بابا سائیں اور شہباز کے والد کی دشمنی میں یہ سارے محرکات موجود تھے۔ شہباز کے والد مرتے وقت دولت اور زمین کے ساتھ ساتھ یہ دشمنی بھی اس کو ورثے میں دے گئے ہیں۔ یہ صرف میری رائے نہیں ہے، آپ کے والد سائیں بھی مجھ سے شہباز کے بارے ان خیالات کا اظہار ہی کر رہے ہیں۔ سائیں سردار بہت جہان نیدہ آدمی تھے، بندے کی بڑی پہچان رکھتے تھے۔“

”مٹھل بابا! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ جب تک مجھے شہباز کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا میں اسے بے گناہ ہی سمجھوں گا۔ بہر حال... کل میں نے اسے کھانے پر بلایا ہے اور مجھے آپ کو مہمان کی عزت کرنے بارے حویلی کے رسم رواج سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ پہلے بھی آپ نے مجھ سے ذکر کیے بغیر شہباز کا پیغام لانے والے بندے کو واپس بھیج کر کوئی اچھا اقدام نہیں کیا۔ کل وہ آ رہا ہے، اگر آپ اس کا استقبال نہیں کرنا چاہتے تو پھر کل کا پورا دن اپنے گھر چلے جائیں۔ میں مہمان کے معاملے میں کوئی بد مزگی نہیں چاہتا۔“ میں نے تحسانہ اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”جی نادر سائیں۔ آپ کے فرمان کی تعمیل ہوگی۔“ مٹھل بابا نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ میں نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آج سے پہلے میں نے ان سے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی، اس لئے میں ندامت محسوس کر رہا تھا، تاہم میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ ان کے اعصاب پر دشمنی کا بھوت سوار تھا جبکہ میں اور شہباز اُس دشمنی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن مٹھل بابا بھی میرے نظریے کے قائل ہو جائیں گے۔ انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شہباز بابا سائیں کے قتل میں ملوث نہیں ہے۔

اگلے دن میں ذرا جلدی اٹھ گیا۔ میں نے خانساں کو ہدایات جاری کر دیں کہ آج کھانے میں ذرا اسپیشل قسم کی ڈشز تیار کرے۔ میں آج اپنے اس چچا زاد بھائی سے ملنے والا تھا جسے میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا، حالانکہ وہ اس گٹھ میں میرا واحد قریبی رشتہ دار تھا۔ مٹھل بابا کے بارے میں مجھے صبح ہی اطلاع مل گئی تھی کہ وہ کل رات اپنے گھر چلے گئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ شاید شہباز کی آمد کے پیش نظر وہ نہ آئیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ آج حویلی میں نہ آئیں۔ یہ ممکن تھا کہ شہباز کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ کوئی ایسی حرکت کر گزرتے جو میرے لیے شرمندگی کا باعث بن جاتی۔

(جاری ہے)

دوپہر بارہ بجے کی قریب مجھے شہباز کی آمد کی اطلاع ملی۔ میں خود اس کا استقبال کرنے کے لئے حویلی کے گیٹ تک چلا گیا۔ وہ اپنی جدید ماڈل کی لینڈ کروزر سے نیچے اتر کر کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی قد و قامت مجھ سے بھی نکلتی ہوئی تھی حالانکہ میں بھی خالص دراز قد تھا۔ سرخ و سپید رنگت، ہلکی ہلکی داڑھی مونچھیں اور سر پر سندھی ٹوپی میں وہ خاصہ وجہ لگ رہا تھا۔ میرے لیے سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ ڈرائیور تھا اور نہ کوئی مسلح گارڈ، حالانکہ کل فون پر وہ مجھے اپنے مسلح گارڈز کے بارے میں بتا چکا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ شاید اسے بھی مجھے دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ہی اس کے تایا کا بیٹا ہوں۔

”میں اپنے بڑے بھائی کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔“ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ میں بھی آگے بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ یہ دو افراد کی نہیں بلکہ دو خاندانوں کی ملاقات تھی۔ برسوں کی کدورتیں اور نفرتیں ایک لمحے میں کیسے ختم ہوتی ہیں... اس کا صحیح انداز اک مجھ اسی وقت ہوا تھا۔

”شہباز! تم اپنی سیوریٹی کے بغیر آئے ہو...!“ گرجو ششی سے بغل گیر ہونے کے بعد میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جی سائیں۔ میں آج اپنے مسلح گارڈز کے بغیر یہاں آیا ہوں۔ ایک تو میں اپنے تایا سائیں کی تعزیت کے لیے حاضر ہوا ہوں اور دوسرا یہ ثابت کرنا بھی مقصود تھا کہ میں خاندانی اختلاف ختم کرنے کے لئے کتنا سنجیدہ ہوں۔“ شہباز کے جواب نے میرا دل باغ باغ کر دیا۔ وہ ایک وڈیرا تھا اور ممکن تھا کہ کئی مخالفین کی آنکھوں میں کھٹکتا بھی ہو، اس لئے مسلح محافظ رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ ایسے میں جذبہ خیر سگلی کے اظہار کے لیے بغیر مسلح گارڈز کے مجھ سے ملنے چلے آنا اس کے خلوص اور سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

”آؤ... اس حویلی کو اپنی ہی حویلی سمجھو۔“ میں نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ شہباز نے بھی میری تقلید کی تاہم وہ بغور اس پاس کھڑے مسلح افراد اور حویلی کے دیگر ملازمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت میں نے بھی نوٹ کی۔

”کیا دیکھ رہے ہو...؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سائیں، دراصل آپ کے ملازمین میں مٹھل بابا دکھائی نہیں دے رہے۔ شاید ان کی مجھ سے ناراضی ختم نہیں ہوئی۔“ شہباز پچھلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ مجھے بھی اس سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”مٹھل بابا کو تمہارے حوالے سے کچھ تحفظات ہیں تاہم، جلد ہی انہیں بھی سمجھ آ جائے گی۔ فی الحال انہیں چھوڑو، اپنی سناؤ۔“

”اپنی کیا سناؤں نادار سائیں! بس بابا کی موت کے بعد خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی ان کی بہت یاد آتی ہے۔ اپنوں سے جدائی کا غم کیسا ہوتا ہے... یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی، رہ گئی مٹھل بابا کی میرے بارے میں تحفظات کی بات! تو میں ان کی ذہنی حالت کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ وہ میرے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ سردار سائیں پر حملہ میں نے ہی کروایا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے تحفظات دور کر سکوں۔ ویسے وہ اپنی عمر کی وجہ سے میرے لیے قابل احترام ہیں۔“ شہباز نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ہم حویلی کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ شہباز بڑی دلچسپی سے حویلی کے جائزہ لے رہا تھا۔ ”جانتے ہیں نادار سائیں! یہ حویلی ہمارے پڑدادا کے دور میں بنی تھی پھر دادا جان کو مل گئی اور اس کے بعد بنوارے میں تایا سائیں کے حصہ میں آ گئی۔ یہ اس گوٹھ کی سب سے قدیم عمارت ہے اور اتنی پرانی ہونے کے باوجود آج بھی بہت مضبوط ہے۔“ وہ حویلی کے در و دیوار کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں، مجھے یہ باتیں مٹھل بابا سے معلوم ہو چکی ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ عمارت انگریز دور کی یادگار ہے۔ بابا سائیں نے بھی اس کے طرز تعمیر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کروائی، بس رنگ و روغن کرواتے رہے ہیں۔“

بات کرتے ہوئے اب ہم حویلی کے ڈرائنگ روم میں آچکے تھے۔ میں نے شہباز کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا مجھے اس بات نے بہت متاثر کیا تھا کہ وہ آج میرے پاس آتے وقت اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے ابھی تک اس کے لہجے اور انداز گفتگو میں وڈیریوں والی کوئی جھلک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک سلجھا ہوا اور نفیس انسان لگ رہا تھا۔

”شہباز جہاں تک مجھے مٹھل بابا کے توسط معلوم ہوا ہے تو میرے والد اور چچا سائیں کے درمیان اصل وجہ تنازعہ وہ پچاس ایکڑ زمین بنی تھی جو ہمارے گوٹھ کے بالکل درمیان میں واقع ہے اور عدالت میں مقدمہ بھی اسی زمین کا چل رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم بیٹھ کر اس زمین بارے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس زمین میں سے پچیس ایکڑ تمہارے نام کر دیتا ہوں۔ آدھی زمین تمہاری، آدھی ہماری...“ میں نے کہا تو شہباز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ عود آئی۔

”نادار سائیں! آپ واقعی بہت بڑے دل کے مالک ہیں، مگر معاف کیجے گا۔ میں وہ زمین لینے نہیں آیا، میں نے تو اسی وقت عدالت سے وہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا جب آپ نے سردار سائیں کے قتل کے پرچے میں میرا نام نہ دے کر اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا تھا۔ میں بس عملی اقدام آپ سے ملاقات کے بعد اٹھانا چاہتا تھا۔ میں آج اپنے وکیل کو کہہ دوں گا کہ وہ بابا سائیں کے دور کے اس فضول قسم کے مقدمے کو واپس لے لے۔ میں زمین کا بھوکا نہیں ہوں۔ یہاں آپ سے ملنے اور سردار سائیں کی قبر پر آپ کے ہمراہ فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ پچیس ایکڑ لے کر واپس گیا تو دل پر بوجھ رہے گا کہ برسوں بعد اپنے تایا زبھائی سے ملنے گیا اور وہ بھی زمین کی خاطر...! نہیں نادار سائیں، یہ زمین آپ کو ہی مبارک ہو۔ اب میں پچیس ایکڑ تو کیا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی قبول نہیں کروں گا۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں۔“

شہباز عمر میں مجھ سے خاصا چھوٹا تھا مگر اس نے جس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا میں خود کو اس کے سامنے چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا۔ ہمارے درمیان تقریباً ایک گھنٹے تک مزید بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران ہم نے اپنی خاندانی دشمنی کو دوستی میں بدلنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دونوں اطراف سے ایسے افراد کو بھی لگام ڈال کر رکھی جائے گی جو ماضی میں، جلتی پر تیل ڈالنے میں ملوث رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد شہباز میرے ہمراہ بابا سائیں کی قبر پر دعا کے لیے گیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے والد اور والدہ کی قبر پر بھی بیٹھا رہا۔ اس وقت شاید ہم دونوں کو ہی اچھی طرح تھا۔ قبرستان کچھ وقت گزارنے کے بعد ہم واپس حویلی آ گئے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ چائے پینے کے بعد شہباز نے اجازت چاہی اور ساتھ ہی مجھ سے درخواست بھی کی کہ جیسے ہی تایا جان کے قاتلوں کے بارے میں کچھ علم ہو تو میں اسے ضرور آگاہ کروں کیونکہ وہ خود بھی یہ جاننے کا خواہش مند ہے کہ وہ کون ہے، جس نے ان کی خاندانی دشمنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار سائیں کو قتل کروایا ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ میری اس بارے میں موجودہ ایس پی سے کافی مرتبہ بات چیت ہوئی ہے۔ ابھی تک پولیس کو کوئی ایسا کلیو نہیں مل سکا جس کی مدد سے قاتلوں تک رسائی حاصل ہو سکے تاہم جیسے ہی میرے علم میں کوئی بات آئے گی، میں اسے آگاہ کر دوں گا۔ اس کا فون نمبر بھی میں نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔

شہباز وعدے کا پابند نکلا۔ تین دن بعد ہی مجھے اس کا زمین والا مقدمہ واپس لینے کی اطلاع مل گئی۔ کہنے کو ہم دونوں ہی وڈیرے تھے مگر ہماری سوچ و ڈیریوں والی نہ تھی۔ تعلیم نے ہم دونوں کی شخصیت کو بدل ڈالا تھا۔ میری اور شہباز کی وہ ملاقات آخری نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی ہمارے درمیان اکثر اوقات ملاقاتیں ہونے لگیں تھیں۔ میں بھی ایک دفعہ مٹھل بابا کی شدید مخالفت کے باوجود شہباز سے ملنے اس کے گھر گیا اور بغیر سیوریٹی گیا تھا۔ مٹھل بابا کو اسی بات پر شدید اعتراض تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں لیکن ان کے تمام خدشات غلط ثابت ہوئے اور میں شہباز سے ملاقات اور اس کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے بعد بہ خیر وعافیت واپس آ گیا۔ میرے لئے یہ بات باعث حیرت تھی کہ شہباز کی حویلی کا ڈیزائن بالکل ہماری حویلی والا تھا۔ شہباز نے بتایا تھا کہ اس کے والد کو اپنی آبائی حویلی سے دلی لگاؤ تھا مگر کیونکہ بھائیوں کے درمیان جانیداد کے بنوارے میں وہ حویلی سردار سائیں کے حصہ میں چلی گئی تھی اس لیے اس کے والد نے بالکل اسی طرز کی ایک نئی حویلی تعمیر کروالی تھی۔

میری بہ خیریت واپسی نے مٹھل بابا کی سوچ پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ اپنے موقف پر قائم تھے کہ شہباز مجھے مروانے کا متمنی ہے، بس وہ موافق حالات کا منتظر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ابھی مجھے قتل کروا کر وہ بچھن جائے گا اس لئے اسے مناسب موقع اور وقت کا انتظار ہے۔

مجھے مٹھل بابا کی ان باتوں پر ہنسی آتی تھی۔ ان کا دماغ دشمنی اور قتل سے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ بہر حال میری سوچ ان سے مختلف تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں اپنی حفاظت سے بے پروا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ بابا سائیں کو مارنے والوں کی چپقلش یا دشمنی صرف انہی تک محدود تھی۔ اگر وہ میرے دشمن ہوتے تو اب تک مجھ پر حملہ کر چکے ہوتے۔

زندگی اب ایک ڈگر پر چل پڑی تھی مجھے سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا اور پھر... میری زندگی میں وہ واقعہ رونما ہوا، جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ تیکھے مین نقش والی وہ حسینہ مجھے پہلی ہی نگاہ میں بھاگئی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ بہت زیادہ خوبصورت تھی مگر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے پہلی ہی نظر میں اس کا دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ میں لندن میں آٹھ سال گزار چکا تھا۔ بہت سی خوبصورت اور حسین لڑکیاں نگاہ سے گزری تھیں مگر کسی لڑکی کو دیکھ کر میرے دل کی ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی تھی جو اسے دیکھنے کے بعد ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے گوٹھ کی ایک شادی کی تقریب میں دیکھا تھا، جہاں مجھے مٹھل بابا کے کہنے پر جانا پڑا تھا۔ ایک دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا کہ مٹھل بابا اندر آ گئے۔

”نادار سائیں! مجھے کچھ بات کرنی تھی۔“ انہوں نے کہا۔

”ضرور کریں مگر پہلے صوفے پر بیٹھ جائیں۔“ میں نے اخبار لپیٹ کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ مٹھل بابا ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں مستفسر نگاہوں سے انہیں تنکے لگا۔

”سائیں! کل گوٹھ میں ایک شادی ہے اور یہاں کے رواج کے مطابق آپ کو بھی اس شادی میں شرکت کرنی ہے۔ جب بڑے سائیں زندہ تھے تو وہ بھی گوٹھ میں ہونے والی تقریباً شادی میں شرکت کرتے تھے۔ گوٹھ میں کچھ عرصہ پہلے چند شادیاں ہوئی ہیں تاہم میں نے آپ کو شرکت کا اس لئے نہیں کہا کہ سردار سائیں کی وفات ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔“

”میری جگہ آپ شرکت کریں مٹھل بابا۔“ میں نے بیزار سی سے کہا۔ ”میں وہاں جا کر کیا کروں گا...!“

”میں وڈیرا نہیں ہوں۔“ انہوں نے نصیحتانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ یہاں کا رواج ہے کہ چھوریوں کی شادی میں وڈیرا بطور سرپرست شرکت کرتا ہے۔ جس کی بیٹی کی شادی ہے اس پر آپ کے والد سائیں کے بڑے احسانات ہیں۔ وہ کل خصوصی طور پر میرے پاس کا دعوت نامہ لے کر آیا تھا۔ آپ نے پہلے ہی یہاں کے بہت سے رسم و رواج کو بدل ڈالا ہے، مگر اس روایت کو قائم رکھیں۔“

”ہمم...“ میں نے ہنکارہ بھرا۔ ”ٹھیک ہے، میں کچھ دیر کے لئے چلا جاؤں گا مگر میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکوں گا۔ کل کتنے بجے ہے شادی...“ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

”کل دوپہر کے وقت جانا ہے۔“ مٹھل بابا نے جواب دیا۔ ”میری بات تسلیم کرنے کا بھی شکریہ۔“

”بابا! مجھے آپ کی ہر جائز بات تسلیم ہے۔ مجھے حویلی کے رسم و رواج سے بھی کوئی پر خاش نہیں ہاں البتہ ان رسوم سے پر خاش ہے جن کی وجہ سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہو۔ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ آپ شہباز کے معاملہ میں مجھ سے ناراض ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن آپ کو بھی یہ یقین آجائے گا کہ شہباز کا بابا سائیں کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے تقبیبی لہجے میں کہا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے سائیں کہ ایک دن آپ کو میری بات کا یقین آجائے۔“ مٹھل بابا نے جواب دیا۔ ”شہباز نے جس طرح آپ کو شیشے میں اتارا ہے، اس سے مجھے بڑے سائیں کی اس بات پر یقین ہو گیا ہے کہ یہ لونڈا اپنے باپ سے بہت تیز ہے۔“

”اگر وہ اتنا ہی تیز ہے تو پھر میں اس سے ملنے تنہا اس کے گھر گیا تھا، وہ مجھے واپسی پر کسی بھی جگہ آسانی سے مروا سکتا تھا۔ مجھے مروانے بغیر تو اسے میری جانیداد نہیں مل سکتی...“ میں نے کہا۔

”آپ نے شاید میری بات صرف سنی ہے اس پر غور نہیں کیا۔ سردار سائیں نے کہا تھا کہ یہ لونڈا اپنے باپ سے زیادہ تیز ہے۔ شہباز آپ کو قتل کروانا چاہتا ہے مگر وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت ایسا کیا تو پولیس اسے دھر لے گی۔ ایس پی سراج خان بڑے سائیں کے قتل کے سلسلے میں پہلے ہی اس پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

اسے بھی شک ہے کہ سردار سائیں کا قتل جانیداد کی خاطر ہوا ہے، ایسے میں شہباز فوری طور پر آپ پر حملہ کر واکر اس کے شک کو یقین میں بدلنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ ابھی تو وہ قانون کے شکنجے سے اس لئے بچا ہوا ہے کہ اسے آپ کی حمایت حاصل ہے۔ جب مدعی ہی اس کا حامی ہو تو پھر پولیس کیا کرے...؟ یہ سارے محرکات اس کے ذہن میں موجود ہیں، اس لئے ابھی وہ کسی ایسی حرکت کی جرأت نہیں کر رہا مگر مجھے یقین ہے جیسے ہی اسے موقع ملا، وہ کوئی بھیانک کھیل کھیلے گا۔“

”چھوڑیں مٹھل بابا! یہ باتیں آپ پہلے بھی کافی مرتبہ کر چکے ہیں۔ میں کل دوپہر کو تیار ہوں گا مگر صرف آپ میرے ساتھ جائیں گے۔“ میں نے موضوع بدلے ہوئے کہا۔ مجھے اب اس بحث سے کوفت ہونے لگی تھی۔

(جاری ہے)

”ٹھیک ہے، آپ تیار رہیے گا۔“ مٹھل بابا صوفے سے اٹھے ہوئے بوئے اور باہر کی جانب بڑھ گئے۔ میں پر خیال نگاہوں سے انہیں جانا ہوا دیکھتا رہا۔ میں نے بس رستگاری پر جانے کی ہامی بھری تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جب میں واپس آؤں گا تو اپنا دل اسی حسینہ کے پاس چھوڑ آؤں گا جس کی صرف ایک جھلک نے مجھے محبت نام کے جذبے سے روشناس کرا دیا تھا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت میں مٹھل بابا کے ہمراہ شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ ان کی ضد کے باوجود میں نے مسلح محافظوں کو حویلی میں ہی چھوڑ دیا تھا، تاہم مٹھل بابا نے ایک عدد رائل اپنے پاس رکھ لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ان کے یہ تمام خدشات بے بنیاد ہیں تاہم میں نے انہیں رائل ساتھ لانے سے منع بھی نہیں کیا تھا۔ اب ہر معاملے میں انہیں رکنا تو کتنا بھی مناسب نہ تھا۔ وہ جو بھی کرتے تھے، ان کی نیت صاف ہوتی تھی۔ مقصد صرف میری حفاظت تھا۔ شاید ان کی یہ احتیاط کسی حد تک درست بھی تھی کہ میں بھی اپنی حفاظت سے کچھ لاپرواہا ہو گیا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ بابا سائیکس کے قاتل ابھی تک زندہ تھے۔

شادی پر میرا خصوصی استقبال کیا گیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے سب سے علیحدہ جگہ دی گئی۔ میں اس قسم کے چونچلے ناپسند کرتا تھا تاہم اس وقت خاموشی سے خود پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ وقت گزار کر اور لڑکی کے باپ کو کچھ رقم دے کر وہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں اُس وقت گھر کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے مہمان باہر موجود کرسیوں پر براجمان تھے۔ میری حیثیت شاید سب سے جدا تھی جو میرے ساتھ کسی کو بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میرے بابا سائیکس کے دور سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا تھا اور اب مجھے بھی مجبوراً اس ناپسندیدہ رسم کی پابندی کرنی پڑ رہی تھی۔ بہر حال جب آگیا تھا تو کچھ دیر تک خود پر جبر کر کے بیٹھ رہنا ہی بہتر تھا۔

میں خاموشی سے وقت گزار رہا تھا، تبھی وہ اندر داخل ہوئی جس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں، بلکہ یوں کہوں تو زیادہ بہتر تھا کہ میرے دل کی دھڑکنیں گویا رک سی گئیں۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ گھر کی بیٹھک میں کوئی موجود ہو گا، اسی لئے وہ منہ اٹھائے اندر داخل ہو گئی تھی مگر مجھے دیکھ کر ٹھنک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ کے تاثرات عود آئے۔ شاید وہ مجھے جانتی نہیں تھی مگر میری دوسرے مہمانوں سے علیحدہ موجودگی اور شاندار لباس نے اسے اتنا باور کروا دیا تھا کہ میں کوئی خاص مہمان ہوں۔ وہ ساکن کھڑی مجھے ٹکڑے ٹکڑے جا رہی تھی اور میں بھی مبہوت نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید پہلی ملاقات کی یہ مہویت کچھ دیر مزید قائم رہتی کہ اسی لمحے اس کے پیچھے ایک بوڑھی عورت اندر داخل ہوئی۔

”مہرو! تو ادھر کیا کر رہی ہے...؟ ہر طرف منہ اٹھا کر نہ گھس جایا کر۔ معلوم نہیں، ادھر وڈیرا سائیکس بیٹھے ہوئے ہیں۔“ بوڑھی عورت نے سخت لہجے میں اُس لڑکی سے کہا۔

”معاف کرنا ماسی! مجھے پتا نہیں تھا۔“ اُس کی آواز بھی اس کی طرح بہت خوبصورت تھی۔

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ عورت بھی مجھ سے معذرت کرتے ہوئے چلی گئی جبکہ میں کافی دیر تک گم صم سا اپنی جگہ دروازے کو اشتیاق بھری نگاہوں سے ایسے دیکھتا رہا گویا میرے اس طرح دیکھنے سے وہ دوبارہ نمودار ہو جائے گی، مگر وہ بس میرے دل کے پرسکون سمندر میں تلاطم پیدا کرنے آئی تھی، مجھے محبت کے بے چین جذبے سے روشناس کروانے آئی تھی۔ میں شادی کی اس تقریب سے جلدی رخصت ہونا چاہتا تھا تاہم مہرو کو دیکھنے کے بعد میرا وہاں سے جانے کو دل ہی نہ چاہ رہا تھا۔ میں دانستہ اس امید پر وہاں زیادہ دیر تک رکا رہا کہ شاید وہ مجھے دوبارہ دکھائی دے جائے مگر میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں لندن میں نہیں، سندھ میں تھا اور یہاں شادی کی ہر تقریب میں عورتوں کے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام ہوتا تھا۔ زنان خانے کی طرف جانا مردوں کے لیے سختی سے ممنوع تھا۔

بالآخر مجھے واپس آنا پڑا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ واپسی کے دوران بھی وہ لڑکی میرے حواس پر چھائی رہی۔ مجھے اس بوڑھی عورت کے توسط سے اس کا نام ہی معلوم ہو سکا تھا، اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ تھی یا نہیں...! اسے دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ ابھی وہ غیر شادی شدہ تھی تاہم اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شادی شدہ ہوتی۔

حویلی واپس پہنچ کر بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا اور اگلے چند دن بھی یہی معاملہ رہا۔ شروع شروع میں تو میرا خیال تھا کہ اسے دیکھ کر میری جو حالت ہوئی تھی وہ بس ایک وقتی جذباتی جھٹکا ہے اور چند دنوں تک وہ میری یاد سے محو ہو جائے گی مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ مہرو تو میرے حواس پر اس طرح سے چھائی تھی کہ مجھے اٹھتے بیٹھتے اس کی یاد ستانے لگی تھی۔ دل کی عجیب سی حالت ہو گئی تھی۔ طبیعت پر ہر وقت ایک بے قراری سی چھائی رہتی تھی۔ میں جتنا اسے اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی زیادہ یاد آنے لگتی۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ وہ میرے دل میں کچھ اس طرح سے بس گئی تھی کہ اسے بھلانا میرے لئے ناممکن ہو چکا تھا۔ کبھی مجھ پر وہ وقت بھی گزرا تھا جب میں محبت نام کے اس قسم کے لیلیٰ مجنوں والے جذبات کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور جدید میڈیکل سائنس کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے ایسے جذبات کو دماغ کے ایک کیمیکل کا بیلنس بگڑنے کا شاخسانہ سمجھتا تھا مگر آج میرے دماغ کا کیمیکل بھی اپنا توازن کھو چکا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ عشق اصل میں کس بلا کا نام ہے۔

دو تین دن مزید گزارنے اور خود کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا ادراک ہو گیا کہ اب مہرو کو بھلانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جب اسے بھلانا ممکن نہیں ہے تو پھر کیوں نہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے...! میری عمر اب تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مجھے شادی تو ویسے بھی کرنی تھی، تو پھر مہرو سے ہی کیوں نہ کر لی جائے۔ وہ پاس ہوگی تو دل کی بے قراری کو سکون نصیب ہو جائے گا۔

میں سنجیدگی سے اس کے بارے سوچنے لگا۔ مجھے ایک بار اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیے اگر وہ شادی شدہ ہوئی تو اس طرح بھی شاید میرے دل کو کچھ صبر جانا۔ فی الحال تو رادھی بے چین ہی بے چین لکھتا تھا۔ میں نے اس بارے میں مٹھل بابا کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ ایک وہی تھے جو مجھے مہرو کے بارے میں درست معلومات فراہم کر سکتے تھے، اس لئے اب بہتر یہی تھا کہ میں ان سے اس بارے میں بات کر لیتا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا تو پھر دیر کس بات کی تھی...! میں نے مٹھل بابا کو حکم جاری کر دیا کہ وہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح ہچکچاتے ہوئے میرے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”مٹھل بابا! میں آپ سے کچھ دنوں سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ میں نے کہا تو انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

”جی نادر سائیکس!“ انہوں نے پر تجسس لہجے جواب دیا۔

”بابا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں شادی کر لوں اور اسی سلسلے میں... آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

”اچھا...! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے نادر سائیکس۔ میں تو خود بھی آپ کو یہ مشورہ دینے والا تھا کہ آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ آپ کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور ہمارے گوٹھ میں عام طور پر پچیس سال کی عمر میں چھو کروں کی شادی ہو جاتی ہے۔ میری نظر میں ایک دوا ایسے وڈیرے ہیں جن کی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان سے بات کروں...! ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کو کوئی وڈیرہ بھی انکار نہیں کرے گا۔ یہاں کوئی وڈیرہ اتنی زمین کا مالک نہیں ہے جتنی زمین آپ کے پاس ہے۔“

”مٹھل بابا! یہ میرے شادی کا ذکر ہو رہا ہے، اس میں وڈیروں کا تکرار نہ ہنہ دیں تو اچھی بات ہے۔ زمین کے معاملات سودے بازی میں ٹھیک لگتے ہیں، ان کو شادی سے منسلک نہ کریں۔ میں کسی وڈیرے کی بیٹی کے ساتھ شادی کا ارادہ نہیں رکھتا، نہ مجھے زمین جائیداد کی کوئی ضرورت ہے۔ میں صرف اپنا گھر بسنا چاہتا ہوں اور آپ مہربانی کر کے میرے سامنے ذات پات کا درس مت دیجئے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ آپ اب بابا سائیکس کے اثر سے باہر نکل آئیں تو بہتر ہوگا۔“

”جی نادر سائیکس! جیسے آپ چاہتے ہیں ویسے ہی ہوگا۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟“ مٹھل بابا نے ایک گہری سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے مفاہمت آمیز لہجے میں کہا۔

”اسی لئے تو آپ کو بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یا کنواری؟ یہ بھی آپ کو معلوم کرنا ہے۔ چند دن پہلے میں آپ کے ساتھ گوٹھ کی ایک شادی میں گیا تھا۔ میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔ مجھے بس اتفاقاً وہ دکھائی دے گئی تھی۔ اسے مہرو کے نام سے پکارا گیا تھا۔ آپ اُس کے بارے میں معلوم کریں۔ وہ لڑکی بھولے سے کچھ دیر کے لیے اس بیٹھک میں آگئی تھی جہاں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے کچھ معلوم نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو نادر سائیکس کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں... میں بھی کہوں کہ آپ نے اُس دن شادی سے جلدی رخصت ہونے کی بات کی تھی مگر بعد میں آپ اس وقت تک وہاں موجود رہے جب تک رخصتی نہیں ہو گئی۔ واپسی پر گاڑی میں آپ گہری سوچ میں غرق دکھائی دیئے۔ میں اُس وقت آپ کی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکا تھا مگر اب حقیقت کا ادراک ہو گیا ہے۔ بہر حال میں آج شام تک اس لڑکی بارے میں معلوم کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔“ مٹھل بابا نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا اور سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں نے جواباً کچھ بولنے کی بجائے بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مہرو کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں گے۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا مٹھل بابا نے اگلے دن تک بھی نوبت نہ جانے دی۔ شام کو ملازم نے آکر اطلاع دی کہ مٹھل بابا میرے منتظر ہیں۔ میں فوراً ہی ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

”جی مٹھل بابا! پھر کیا اطلاع لے کر آئے ہیں؟“ میں نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سائیکس! مہرو نام کی جو لڑکی اس دن آپ کے سامنے آئی تھی، میں نے اس کے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔ اس شادی میں اس نام کی ایک ہی لڑکی موجود تھی۔ اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی ہے۔ اس کا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ جس لڑکی کی شادی میں آپ نے شرکت کی تھی، مہرو اس کی سہیلی ہے۔“ میرے حلق سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ وہ شادی شدہ نہیں تھی، یعنی میں چاہتا تو اسے شادی کا پیغام بھیج سکتا تھا۔

”اور کیا معلوم ہوا ہے اس کے بارے میں...! میرا مطلب ہے اس کی شادی نہیں ہوئی مگر ممکن ہے منگنی وغیرہ ہو گئی ہو...“ میں نے پوچھا۔

”نہیں سائیکس، ابھی اس کی بات کسی جگہ طے نہیں ہوئی۔ میں نے پتا کر لیا ہے تاہم نادر سائیکس! یہ درست ہے کہ آپ کی سوچ بڑے سائیکس سے کچھ مختلف ہے اور آپ تمام انسانوں کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے کے بھی قائل ہیں مگر پھر بھی رشتہ کرتے وقت تھوڑی بہت حیثیت تو دیکھ لینی چاہیے۔ وہ لڑکی تو غریب مزارعوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر آپ نے اس سے شادی کر لی تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ سردار سائیکس کے اکلوتے بیٹے نے ایک مزارعے کی بیٹی کو پورے گوٹھ کی مالکن بنا ڈالا۔“ مٹھل بابا قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولے اور میں بے اختیار مسکرا دیا۔

(جاری ہے)

قسط : 3

شاكر لطيف



میرے لئے مہر کے بغیر ایک ایک بیل کا ٹکڑا سٹل ہو رہا تھا۔ جس کی ایک جھلک نے میرا یہ حال کر دیا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے پاس ہوگی، تبھی میری اس بے قراری کو قرار آسکتا تھا۔

”نادر سائیں! وہ لڑکی دوسرے گوٹھ کی ہے۔ اس گوٹھ کی جہاں آپ کے چچا زاد شہباز کا راج چلتا ہے۔“ مٹھل بابا تذبذب زدہ لہجے میں بولے تو میں چونک پڑا۔

”کہاں رہتی ہے وہ...!“ میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ ان کی بات سن کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نکاح کا پیغام شہباز کے توسط سے بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

”سائیں بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ وڈیرے شہباز کی حویلی کے پاس ہی رہتی ہے۔ اس کا باپ کسی دور میں آپ کے مرحوم چچا کا منشی تھا۔ زمین وغیرہ کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اب اس کی وفات کے بعد ان کے گھر کا خرچ اس زمین کے ٹھیکے سے چل رہا ہے جو مہر کے باپ کی آبائی زمین ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ سائیں شہباز نے اس زمین پر قبضہ کیوں نہیں کیا...!“

”اس لیے کہ وہ ویسا نہیں ہے جیسا آپ اس کے بارے میں سوچتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

”ٹھیک ہے سائیں، میں ذرا مینوں کا چکر لگاؤں۔ آپ جو بھی فیصلہ کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔“ مٹھل بابا نے کہا اور خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

”فیصلہ تو ہو چکا۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب میں انہیں تو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ مہر نے میرے دل میں آگ لگا دی تھی۔ جب سے اسے دیکھا تھا مجھے ایک عجیب سی بے چینی لاحق ہو گئی تھی۔ اب مجھے جو کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ اب شہباز سے بات کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ مہر کا تعلق اس کے علاقے سے تھا، یہ جاننے کے بعد مٹھل بابا کی بجائے شہباز کے ذریعے بات آگے بڑھانا زیادہ بہتر تھا۔ میں نے فون اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

”ہیلو نادر سائیں! کیسے ہیں آپ؟ آج بڑے دنوں بعد فون کیا ہے۔“ کچھ دیر بعد ہی شہباز کی آواز سنائی دی۔

”بس کچھ مصروف تھا اس لیے فون نہیں کر پایا۔ شہباز! مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے اور میں نے اسی سلسلے میں فون کیا ہے۔“

”میں سن رہا ہوں۔ آپ حکم کریں، مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔ میرے لئے تو یہ اعزاز کی بات ہے کہ وڈیرے نادر سائیں نے مجھے کسی کام کے قابل سمجھا۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شہباز! میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد ضرورت ہے“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ شادی کرنا چاہتے ہیں...! سائیں یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ شہباز نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق تمہارے گوٹھ سے ہے۔ میں نے اسے ایک شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ اس کا والد تمہارے والد کا منشی رہ چکا ہے۔ لڑکی کا نام مہرو ہے اور وہ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی ہے۔ میں نے پتا کر دیا ہے۔ اس کی کہیں بات بھی پکی نہیں ہوئی۔“ میری بات سن کر لاٹن پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ”ہیلو... شہباز! کیا تم میرے بات سن رہے ہو؟“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”جی سائیں! سن رہا ہوں۔ میں نے شاید ایک دو بار اس لڑکی کو اپنی حویلی میں دیکھا ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کا مرحوم باپ کسی زمانے میں واقعی ہمارا منشی تھا مگر سائیں وہ تو...“ شہباز بات کرتے ہوئے یلخت خاموش ہو گیا۔

”شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ لڑکی چھوٹی یا بیچ ذات سے تعلق رکھتی ہے تو میری بات سن لو شہباز! میں اس ذات پات کے خود ساختہ قانون کو نہیں مانتا۔ میرے لیے تمام انسان برابر ہیں، اس لیے مہرانی کر کے مجھے وڈیروں والے درس مت دینا۔ اس قسم کے کافی لکچر میں مٹھل بابا سے سن چکا ہوں۔“ میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں نادر سائیں۔ میرے ذہن میں واقعی یہ بات آئی تھی اور اب مجھے اپنی اس سوچ پر ندامت کا احساس بھی ہو رہا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ بڑے شریف لوگ ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک دو دفعہ ان کی مالی مدد کرنے کی کوشش کی تھی تاہم انہوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایسے خوددار لوگ آج کل کہاں ہوتے ہیں...! غالباً میری زمینوں کے ساتھ ان کی بھی تھوڑی بہت زمین ہے جس کے ٹھیکے سے ان کے گھر یلو اخراجات چلتے ہیں۔ میں اس سے زیادہ ان کے بارے میں نہیں جانتا۔“

”ان کی زمین تمہاری زمین کے ساتھ واقع ہے اور مٹھل بابا کو اس بات پر حیرت ہے کہ ابھی تک تم نے ان کی زمین پر قبضہ کیوں نہیں کیا...“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

”نساوقات انسان کے ذہن میں کسی کی شخصیت کی ایک منفی تصویر بن جاتی ہے اور وہ اس کو مثبت روپ میں قبول کرنے پر کسی طور آمادہ نہیں ہوتا۔ مٹھل بابا بھی اپنے ذہن میں میری ایک منفی تصویر بنا چکے ہیں لیکن مجھے کوئی حیرت نہیں ہے۔“ شہباز کی پر خیال آواز سنائی دی۔ ”بہر حال آپ مجھے حکم کریں! میں اس سلسلے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”شہباز! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے طرف سے مہر کے لیے پیغام لے کر جاؤ بلکہ تم کل ہی اس کی والدہ سے اس سلسلے میں بات کرو۔“

”ارے سائیں اتنی جلدی کیوں ہے...؟ لگتا ہے آپ کو اس سے عشق ہو گیا ہے۔ ویسے وڈیروں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دل لگی تو کرتے ہیں مگر عشق کے چکروں میں نہیں پڑتے مگر آپ لندن سے کیا لوٹ کر آئے، سارے ریت رواج ہی توڑنے پر تل گئے ہیں۔“ وہ حیرانی سے بولا۔

”ہاں شہباز! مجھے اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی کہ میں اس کی ایک جھلک پر ہی بری طرح گھائل ہو گیا ہوں۔ میں اسے جلد از جلد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”آپ بے فکر رہیں، میں کل ہی ان کے ہاں پیغام لے کر جاتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ انکار نہیں کریں گے بلکہ ان کے لیے تو یہ فخر کی بات ہوگی کہ ان کی لڑکی اتنے بڑے وڈیرے کے گھر بیٹا رہی جارہی ہے۔ میں آپ کو کل شام تک ان کے جواب سے آگاہ کر دوں گا۔“ شہباز نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

وقت ویسے تو بڑی جلدی کٹ جاتا ہے مگر جب انسان کو کسی کا انتظار ہو تو پھر ذرا مشکل سے کٹتا ہے۔ میں نے وہ پورا دن اور رات بڑی بے چینی میں گزاری۔ اگلے دن بھی میری یہی حالت تھی۔ میں ایک ایک بیل کے گزرنے کو محسوس کر سکتا تھا، ایک ایک لمحہ گن سکتا تھا۔ میں شام تک اپنے کمرے ہی موجود رہا، پھر جیسے ہی میرے فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھا لیا۔

”سائیں! فوراً ہی فون اٹھا لیا ہے... کیا فون کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے؟“ دوسری جانب سے شہباز کی حیرت بھری آواز سنائی دی تو میرے چہرے پر خجالت کے تاثرات ابھر آئے۔

”نہیں، وہ بس اس وقت میں اتفاق سے فون کے پاس موجود تھا۔“ میں نے کھیانے لہجے میں جواب دیا۔ ”تم اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ مہر کی والدہ نے کیا جواب دیا ہے؟“

”ارے سائیں انہوں نے کیا جواب دینا ہے... وہ تو میری بات سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ فوری طور پر تو ان کے منہ سے کوئی بات ہی نہیں نکل سکی۔“ اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

”آگے بھی تو بتاؤ کہ انہوں نے مزید کیا کہا...“ میں نے بے تابی سے پوچھا تو شہباز بے اختیار ہتھکڑ لگا کر ہنس پڑا۔

”سائیں عشق کیا ہوتا ہے، یہ آج پتا چلا۔ بہر حال میں آپ کو مزید نہیں ترپاؤں گا۔ دل تھام کر سن لیں! مہر کی والدہ نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے اور کہا ہے کہ اب مہر وڈیرے نادر کی امانت ہے، جب چاہے آکر لے جائے۔“

شہباز کا جواب سن کر میں خوشی سے سرشار ہو گیا۔ گو اب مہر و میری ہونے والی تھی۔ زندگی میں محبت تو ہر کوئی کرتا ہے مگر محبت ہر کسی کو ملتی نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ مجھے اچانک ہی کسی سے محبت ہوئی اور اب وہ چند دن کے اندر اندر میری زندگی میں داخل ہونے والی تھی۔ بابا سائیں کی وفات کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور شاید مہر وہ پہلی خوشی تھی جو ان کی موت کے بعد مجھے نصیب ہوئی تھی۔ ہر خزاں کے بعد بہار بھی تو آتی ہی ہے میری زندگی میں بھی بہار آنے والی تھی۔

شہباز نے یہ بھی بتایا کہ مہر کی والدہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ میں کل دوپہر اس کی حویلی میں آ رہا ہوں پھر وہیں سے ہم دونوں مہر کی والدہ سے ملنے جائیں گے۔ مہر کی والدہ کی رضامندی کے بعد میں اب اس معاملے کو طول دینے کا خواہش مند نہیں تھا۔ مہر کو پانے کی تمنا میں، میں یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ میرے باپ کے قاتل ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے تھے اور میں کسی بھی وقت ان کے نشانے پر آسکتا تھا۔ میرا دشمن خاموشی سے اپنی چال چل رہا تھا اور میں مہر کے عشق میں مبتلا ہو کر سب کچھ فراموش کیے ہوئے تھا۔

اگلے دن شہباز کے ہاں جانے کی تیاری کرنے کے بعد میں نے مٹھل بابا کو بلا لیا کہ انہیں بھی صورتحال سے آگاہ کر سکوں۔

انہوں نے میرے بات حیرت سے سنی اور پھر بولے۔ ”سائیں! مجھے لگتا ہے آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ شادی کا معاملہ ہے اور آپ ایک لڑکی کو اپنی عزت اور اس پورے گوٹھ کی مالک بنانے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں لڑکی اور اس کے خاندان بارے میں مزید معلومات حاصل کر لیتے تو بہتر تھا۔“

”ہیں شہباز کے توسط سے سب معلومات حاصل کر چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور میرے لئے اتنا کافی ہے کہ شہباز نے ان کے خاندان کی شرافت کی ضمانت دی ہے۔“

”شہباز کے علاوہ بھی کسی اور ذریعے سے معلومات کر لینی چاہیے تھی۔“ مٹھل بابا بولے۔

”میرے لیے شہباز سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وہ میرا چچا زاد بھائی ہے، کبھی میرے لیے برا نہیں سوچے گا۔ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں، وہاں سے ہم مہر کے گھر جائیں گے۔“

”مگر آپ کا کیلے جاننا مناسب نہیں ہے نادر سائیں۔ آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سردار سائیں کو کس طرح قتل کیا گیا تھا۔“ وہ ناصحانہ لہجے میں بولے۔ ”آپ کو حالات کی گنجی کا کوئی اندازہ نہیں ہے نادر سائیں۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور دشمنی میں دوسرا موقع بھی نہیں ملتا ورنہ اگر بڑے سائیں اس حملے میں زندہ بچ جاتے تو شاید شہباز کب کامنوں مٹی تلے دفن ہو چکا ہوتا۔“

”مٹھل بابا! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ شہباز کا بابا سائیں کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ٹھنڈے دماغ سے ایک بار غور کریں۔ اگر اس کا اس قتل سے کوئی تعلق ہوتا تو اب تک پولیس کو اس کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل چکا ہوتا مگر دیکھیں! بابا سائیں کی موت کو چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور پولیس قاتلوں بارے کوئی معمولی سا کلیو بھی حاصل نہیں کر پائی۔“

”اسی وجہ سے تو میرا شہباز پر شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔“ مٹھل بابا تیز لہجے میں بولے۔ ”وہی اتنا پکا کام کر سکتا ہے کہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہ چھوڑے، بہر حال میں آپ کو اکیلے جانے سے منع کروں گا۔“

”میں نے آپ سے اجازت نہیں طلب کی، آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ میرا لہجہ سن کر مٹھل بابا کے چہرے پر دکھ کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

”میں اپنی اوقات جانتا ہوں نادر سائیں! مگر کیا کروں... آپ کی جان بھی بہت عزیز ہے۔ میں آپ کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ اب آپ لندن میں نہیں رہ رہے۔“ یہ کہتے ہوئے مٹھل بابا اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے یوں جانے پر مجھے ہلکی سی ندامت کا احساس ہوا، مگر میں کرتا بھی کیا... ان کی اس سوچ سے اب مجھے چڑھوتی تھی۔ شہباز جب بھی میری حویلی آیا تھا ہمیشہ اپنے محافظوں کے بغیر آیا تھا اور ایک دفعہ میں بھی اس کی حویلی بغیر محافظوں کے جا چکا تھا۔ آج بھی میرا یہی ارادہ تھا اور شاید مٹھل بابا کو غلط ثابت کرنے کے لئے میرا انتہا جاننا اور بھی ضروری تھا، سو کچھ ہی دیر بعد میں اپنی لینڈ کروزر پر روانہ ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور تک کو ساتھ لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد میں شہباز کی حویلی پہنچ گیا۔ اُسے جیسے ہی میری آمد کی اطلاع ملی وہ فوراً میرے استقبال کے لیے پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم اس کی حویلی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”سائیں بتائیں کہ آج کھانے میں کیا ہوا؟ ویسے تو مہر کی والدہ نے بھی کھانے پر ہی بلایا ہے مگر نا جانے ان کا کھانا آپ کو پسند آتا بھی ہے یا نہیں...!“ شہباز نے کہا تو میں بے اختیار ہنس پڑا۔

”تم کسی قسم کا تکلف نہ کرو۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں آج ان کے ہاں ہی کھانا کھاؤں گا چاہے دال روٹی ہی کیوں نہ کھانی پڑے۔“

”ٹھیک ہے سائیں، ویسے بھی میرے گھر کی دیسی مرغی، مہر کے گھر کی دال روٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ شہباز نے کہا۔ اس کی اس چوٹ پر میرے حلق سے ایک فلک شگاف ہتھکڑ بلند ہوا۔

”تم اب جو چاہے سمجھ لو مگر جس دن تمہیں کسی لڑکی سے عشق ہوا، اس دن تمہیں بھی دال دیسی مرغی سے زیادہ لذیذ کتنے لگے گی۔ میرے خیال میں اب مہر کے گھر چلنا چاہیے۔“ میں نے چائے کا آخری گونٹ پی کر کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

مہر کا گھر ویسے تو بہت چھوٹا تھا تاہم صاف ستھرا تھا۔ ان کی چھوٹی سی بیٹھک کی تزئین و آرائش میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سادگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ مہر کی والدہ خالص دیہاتی خاتون تھیں۔ مہر کی بہنوں سے بھی ملاقات ہوئی اور ہم سب نے کھانا بھی ایک ساتھ کھایا مگر ابھی تک وہ کھانی نہیں دی تھی جس کو دیکھنے کو میرے آنکھیں ترس رہی تھیں، تاہم کھانے کے بعد میری مراد برآئی۔ وہ جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے سر پر چادر اوڑھ رکھی تھی اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے میرے سامنے موجود میز پر رکھی تو لمحہ بھر کے لئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے پر شوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ گھبراہٹ سے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہی وہ تیزی سے واپس مڑی اور بیٹھک سے نکل گئی۔

لمحہ بھر کی اس ملاقات نے میرے دل میں آگ سی لگا دی۔ میں ہونق صورت بنائے دروازے کو دیکھتا ہوں۔ شہباز نے کھنکھار کر میری توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ میں اور شہباز کافی دیر تک مہر کی والدہ سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان پر واضح کر دیا کہ مجھے جہیز کے نام پر کچھ نہیں چاہیے اور شادی کے تمام اخراجات میں کروں گا۔ طے یہ پایا کہ نکاح سادگی سے ہوگا، جس میں بس مہر کے قریبی رشتہ دار شریک ہوں گے اور میں ویسے پر گوٹھ کے لوگوں کو بلا لوں گا۔ میں نے مہر کی والدہ کو شادی کے اخراجات کے لیے رقم بھی دے دی جو انہوں نے پچکچاتے ہوئے قبول کر لی۔

میں جب اپنی حویلی واپس پہنچا تو چھانک پر مٹھل بابا کو منتظر پایا۔ انہیں دیکھ کر مجھے ایک بار پھر اپنے صبح کے رویے پر ندامت محسوس ہونے لگی اگرچہ سکیورٹی گارڈ نے گیٹ کھول دیا تھا تاہم میں گاڑی سے اتر کر مٹھل بابا کی جانب بڑھ گیا۔

”بابا! میں اپنے رویے پر آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ میں نے ان کے قریب جاتے ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”ارے نادر سائیں! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وڈیرے اپنے ملازموں سے معذرت نہیں کیا کرتے، بھلے غلطی ان کی کیوں نہ ہو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے وڈیرہ نہ کہا کریں مٹھل بابا۔ مجھے یہ لفظ پسند ہے نہ وڈیرہ کلچر، بہر حال میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مہر کی والدہ نے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔ شادی کے لئے اگلے ہفتے کا دن طے ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ مٹھل بابا کے چہرے پر ہلکی سی حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔

(جاری ہے)

”آپ کچھ جلدی نہیں کر رہے...!“ وہ متذبذب لہجے میں بولے۔ ”میرا مطلب تھا کہ کسی معمولی آدمی کی شادی نہیں ہے، سردار سائیں کے بیٹے کی شادی ہے۔ کچھ تیاریاں تو کرنی ضروری ہیں۔“

”میں نے زیادہ نمود و نمائش نہیں کرنی مٹھل بابا۔ بس دعوت و لیمہ کا انتظام آپ کے سپرد کر رہا ہوں، باقی... نکاح کی تقریب سادگی سے ہوگی۔“ میں نے جواب دیا

”ٹھیک ہے نادر سائیں! جیسے آپ کی مرضی۔ آپ کی مرضی کے مطابق سارا انتظام ہو جائے گا۔ نکاح کی تقریب میں کون کون جائے گا؟“ مٹھل بابا نے سوال کیا۔

”یہ فیصلہ بھی آپ نے ہی کرنا ہے۔ میرے خیال میں علاقہ کے چند معززین ساتھ لے لیے جائیں تو کام چل جائے گا، ساتھ چند خواتین بھی ہو جائیں تو بہتر ہے۔ ویسے میں آپ جتنے چاہے افراد کو بلا لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور ہاں! وہاں شہباز بھی ہوگا۔ آپ اگر اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تو آپ کی مرضی مگر نکاح کی تقریب میں کوئی بد مزگی نہیں ہونی چاہیے۔ نکاح خواں کا بھی بندوبست کر لیجیے گا۔“ میں نے قدرے تفصیل سے اُن کو ساری بات سمجھا دی۔

مٹھل بابا نے میری ہدایات کے مطابق شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تین دن میں شادی کے کارڈ چھپ گئے، سب خریداری بھی کر لی گئی۔ حویلی کولائٹوں سے دلہن کی طرح سجایا گیا۔ میں ایک ایک دن گن کر گزار رہا تھا۔ مجھے اپنے احساسات پر ہنسی بھی آتی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ ایک لڑکی کے عشق نے مجھے بالکل دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ انتظار کے لمحے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں بالآخر کٹ ہی جاتے ہیں۔ میرے بھی کٹ گئے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میں چار گاڑیوں کے چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ مہر و گھر روانہ ہوا۔ روانگی سے قبل یہیں شہباز کو فون پر اپنی روانگی کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔ میں نے شیر وانی زیب تن کر رکھی تھی تاہم سہرا باندھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھے اس طرح کے چونچلے پسند نہیں تھے۔

ہمارا چھوٹا سا قافلہ جب مہر و گھر کے سامنے پہنچا تو میں نے وہاں شہباز کی لینڈ کرور کھڑی دیکھی۔ وہ وعدے کے مطابق مجھ سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں بھی گاڑی سے اتر آیا اور مٹھل بابا اور دوسری گاڑیوں میں ساتھ آئے دیگر افراد کے ساتھ مہر و گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی والدہ اور رشتہ دار مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کے درمیان شہباز بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور ہار پہنایا۔ مٹھل بابا اس وقت میرے بالکل ساتھ ہی موجود تھے۔ شہباز کی نگاہیں ان سے بھی چار ہوئی تھیں تاہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو نظر انداز کر دیا۔ موجودہ حالات میں ان کا یہی طرز عمل مناسب تھا۔ مہمانوں کو وہاں نصب شامیانے میں رکھی گئی کرسیوں پر جبکہ مجھے سامنے موجود گلے چھوٹے سے اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ میرے ایک طرف مٹھل بابا اور دوسرے طرف شہباز بیٹھ گئے تھے۔ میرے لئے یہ خوشی کی بات تھی کہ وہ دونوں آج ایک جگہ امن و امان کے ساتھ یکجا تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رفتہ رفتہ دونوں کے دلوں میں موجود کدورتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

مہر و میری زوجیت میں آگئی تھی۔ میں اب جلد از جلد اسے لے کر اپنی حویلی جانا چاہتا تھا مگر ابھی مہمانوں کی تواضع باقی تھی اس لیے کھانا کھانے تک رکنا میری مجبوری تھی۔ کھانا کھانے کے بعد رخصتی کا وقت بھی آ ہی گیا۔ کچھ دیر تک آنسو بہانے کے بعد ماں بیٹی ایک دوسرے سے جدا ہوئیں، پھر مہر و میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے بھی شہباز سے بغل گیر ہوتے ہوئے الوداع کہا اور مہر و کے ساتھ گاڑی کی پیچھلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم حویلی واپس پہنچ گئے۔ اسی لمحے حویلی کے اندر نی حصہ سے کچھ خواتین برآمد ہوئیں۔ یہ ہمارے گوٹھ کی بی خواتین تھیں۔ ان میں سب سے آگے مٹھل بابا کی بیگم تھیں جن کو میں چچی کہا کرتا تھا۔

”مالکن کوان کے کمرے میں لے جاؤ۔“ مٹھل بابا نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ہائیں مالکن...“ ان کی بیوی نے مہر و سے کہا تو اس نے نگاہیں اٹھا کر اجازت طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور پھر میرے اثبات میں سر ہلانے پر ان خواتین کے ساتھ حویلی کے اندر و نی حصہ کی جانب بڑھ گئی۔

”نادر سائیں! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے صبح یہ بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔“ مٹھل بابا نے کہا تو میں چونک پڑا۔

”ایسی کیا بات ہے جو آپ کو ابھی کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ آئیں، اندر چلیں۔ میرا چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑے۔ ”اب بتائیں، آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟“ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر بیٹھنے اور خانماں کو چائے کا کہنے کے بعد میں نے ان سے سوال کیا۔

”نادر سائیں! آج صبح میں جب اپنے گھر پر موجود تھا تو ایس پی سراج خان کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کے والد کے قتل کی تفتیش میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔“ مٹھل بابا نے کہا۔ میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کیا پیش رفت ہوئی ہے...! کیا بابا سائیں کے قاتلوں کا پتا چل گیا ہے؟“ میں نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

”اصل آدمی کا تو ابھی پتا نہیں چلا مگر امید پیدا ہوئی ہے۔ دراصل کچے کے علاقے کا ایک ڈاکو گرفتار ہوا ہے، اس سے تفتیش میں معلوم ہوا ہے کہ اسے سردار سائیں کے قتل کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہے۔ اس نے اتنا تو اگل دیا ہے کہ سردار سائیں پر جو حملہ ہوا اس میں کچے کے دوسرے اشتہاریوں کے ساتھ وہ بھی شامل تھا اور اس کام کے انہیں اچھے خاصے پیسے بھی ملے تھے۔ تاہم ابھی تک اس نے یہ نہیں بتایا کہ حملہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کس کے کہنے پر کیا تھا۔ تاہم سراج خان کا کہنا ہے کہ جلد ہی وہ اس منہ کھولے گا۔ یہ بات بھی اس نے تشدد کے دوران مدہوشی کے عالم میں بتائی تھی، مگر جب اس سے مزید تفتیش کی گئی تو وہ اڑ گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ یہ اعتراف کرنے پر تیار ہے کہ سردار سائیں کو اس کے اور اس کے چند اشتہاری ساتھیوں نے مل کر مارا ہے لیکن وہ اس کا نام نہیں بتائے گا جس کے کہنے پر حملہ کیا گیا تھا۔ ویسے... آپ کے مرحوم چچا کے بھی کچے کے اشتہاریوں کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔“ مٹھل بابا نے آخر میں ایک بار پھر شہباز کی جانب اشارہ کر دیا۔

”اشتہاریوں سے تو کوئی بھی پیسے دے کر کام کروا سکتا ہے...!“ میں نے پُرسوج لہجے میں کہا۔ ”ویسے اگر شہباز ملوث ہوتا تو ان اشتہاریوں کے ذریعے مجھے راستے سے ہٹانے کے اس کے پاس کئی مواقع آتے تھے، وہ اس وقت بھی یہ کام کروا سکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے سائیں! ذرا اس بندے کو اس کا نام اگل لینے دیں پھر دیکھ لیتے ہیں۔“ مٹھل بابا نے کہا۔ ”ویسے اگر شہباز اس قتل میں ملوث نہ ہوا، تو میں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ وقت بھی جلد ہی آنے والا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے خاموش ہو گئے تاہم ان کے چہرے سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔ کسی ایسے اشتہاری کی گرفتاری میرے لیے بھی خوش آئند تھی جو میرے بابا کو قتل کروانے والے شخص بارے جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد ہی اس کا نام اگل دے گا۔ ہر انسان کی قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر وہ کتنی دیر تک تشدد برداشت کر سکتا تھا۔ بہر حال اس وقت میں اس بارے میں زیادہ مغرما رہی کرنے کی بجائے مہر و کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ ابھی شام ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ مجھے مہر و کے پاس جانے کا موقع رات سے پہلے نہیں ملنے والا، ابھی اس کے پاس مٹھل بابا کی بیوی اور کچھ خواتین موجود تھیں۔ رات ہونے کو آئی تو حویلی میں موجود عورتیں اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ سب سے آخر میں مٹھل بابا کی بیگم رخصت ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد بالآخر مجھے وہ لمحات نصیب ہوئی گئے جن کا میں بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

میری خواب گاہ کو گلاب کے پھولوں سے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں ہر طرف بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے بیڈ پر مہر و دلہن کے لباس میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے پاس بیٹھتے ہی وہ کچھ سمٹ سی گئی۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اپنی زندگی کے آٹھ سال لندن میں گزارے تھے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں مشرقی لڑکیوں کی شرم و حیا سے ناواقف تھا۔ میں نے اپنی جیب سے سونے کی ایک انگوٹھی نکالی اور مہر و کا ہاتھ پکڑ کر اس کی محرومی انگلیوں میں پہنادی۔ کچھ دیر تک خاموشی کے یہ لمحات برقرار رہے۔ اس وقت میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں نے جسے پانے کی تمنا کی تھی وہ میرے پاس تھی۔ میرے لیے یہ چند لمحے صدیوں پر محیط تھے۔ میں نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور نثار ہوتی نگاہوں سے اس کے چہرے کو کوٹکتے لگا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنی حسین پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر گہرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

اگلے دن دعوت و لیمہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ مہر و کی شادی پر تو اس کے سارے عزیز و اقارب کی جگہ صرف قریبی رشتہ داروں کو بلایا گیا تھا تاہم ویسے میں اس کے سبھی رشتے دار آئے۔ شہباز بھی موجود تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنے محافظوں کے بغیر آیا تھا اور مجھے اس کا یہ جذبہ خیر سگالی ہمیشہ ہی متاثر کرتا تھا۔

دعوت و لیمہ کے بعد مہر و ایک دو دن کے لیے اپنے گھر گئی اور پھر میں اسے واپس لے آیا۔ اب ہماری عملی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں مہر و کو لے کر کچھ دنوں کے لیے شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے چلا گیا۔ اس کے ساتھ وہاں گزارے ہوئے لمحات بہت خوبصورت تھے مگر واپس آتے ہی مٹھل بابا سے جو خبر سننے کو ملی اس نے میرا سارا نشہ ہر ن کر دیا

میں ایک ہفتے بعد حویلی لوٹا تھا۔ مہر و کمرے میں چلی گئی تھی جبکہ میں مٹھل بابا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں پھر انہوں نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرے بابا سائیں کے قاتل کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ مٹھل بابا نے بتایا کہ میرے جانے کے دو دن بعد ہی پولیس کی حراست میں کچے کے اس اشتہاری کی موت ہو گئی تھی جو میرے باپ کو قتل کروانے والے کا نام جانتا تھا۔ مٹھل بابا کے مطابق وہ اشتہاری، پولیس کے تشدد کے سامنے آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا تھا اور غالب امکان یہ تھا کہ وہ اپنا منہ کھولنے والا تھا مگر اس سے پہلے کے وہ کچھ بتانا کسی نے اس کے کھانے میں زہر ملا دیا۔

”مگر مٹھل بابا... یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اسے زہر آلود کھانا کھلا دے؟ باہر کے آدمی کو تو پولیس اشتہاری ملزمان سے ملنے ہی نہیں دیتی...“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”نادر سائیں! اس سلسلے میں میری ایس پی سراج خان سے بڑی تفصیل کے ساتھ بات ہوئی ہے۔ اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیس پیچیس پولیس اہلکار موجود تھے اور سراج خان کے مطابق کوئی اندر کا آدمی ہی اس حرکت میں ملوث ہے۔ اس نے کچھ پولیس اہلکاروں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ بھی درج کر لیا ہے، تاہم ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس حرکت میں کون ملوث ہے؟ میرے خیال میں اب آپ کو بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ سردار سائیں کو قتل کروانے والا شخص بہت شاطر دماغ انسان ہے۔“

مٹھل بابا کی بات پر میں سوچ میں پڑ گیا۔ مہر و میرے دل دماغ پر کچھ اس طرح سے سوار ہوئی تھی کہ وقتی طور پر میں اس قصے کو فراموش کر بیٹھا تھا مگر جس طرح اس اشتہاری کی موت واقع ہوئی تھی اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگرچہ میرا شک ابھی بھی شہباز پر نہیں تھا کیونکہ میرے خیال میں اس اشتہاری کے معاملے میں جو کھیل رچا گیا تھا وہ شہباز کے بس کے بات نہیں تھی۔ یہ کسی بہت کا یاں آدمی کا کام تھا، تاہم موجودہ صورتحال سے مجھے اتنا دراک تو ہو ہی گیا کہ مجھے اپنی حفاظت سے اتنی لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے۔ میں بزدل نہیں تھا اور نہ موت سے ڈرتا تھا مگر میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں مہر و کے ساتھ جینا چاہتا تھا، اس کے ساتھ زندگی کا لطف لینا چاہتا تھا۔ دنیا میں بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو میری طرح خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جن کو ان کی من چاہی محبت اتنی جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔

”آپ ایس پی سراج خان کے ساتھ رابطے میں رہیں اور جیسے ہی اس معاملے میں کوئی پیش رفت ہو مجھے آگاہ کریں اور ہاں... آج کے بعد میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا، مسلح محافظوں کے ساتھ جاؤں گا۔“ کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے مٹھل بابا سے کہا۔

”جی نادر سائیں، موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے۔ جب تک سراج خان اس آدمی کا کھوج نہیں لگا لیتا، آپ کا احتیاط کرنا ہی بہتر ہے۔ ویسے سراج خان کو چھ سات پولیس والوں پر شک ہے، انہی میں سے کسی ایک نے کھانے میں زہر ملا یا ہے۔ کھانا اس کے سامنے حوالات کی سلاخوں کے دوسری طرف رکھ دیا جاتا تھا۔ ایسا اس لیے کیا جاتا تھا کہ وہ مجبور ہو کر سچ اگل دے۔ یہ کھانا بھی حوالات کے سامنے جان بوجھ کر اسے اذیت دینے کے لیے رکھا گیا تھا تاہم رات کے وقت جب حوالات کے سامنے کوئی نہیں تھا، کسی نے اسے یہ کھانا دے دیا۔ وہ تو پہلے ہی بھوکا تھا، اس نے فوراً کھانا کھا لیا۔ اس کے وہم گمان میں بھی نہ ہو گا کہ کھانا زہریلا ہے۔“ مٹھل بابا پر خیال لہجے میں بولے تو میں نے بھی تفسیہ انداز میں سر ہلادیا۔

”سائیں! کیا بات تھی؟ مٹھل بابا کے ساتھ کافی دیر سے بات چیت کر رہے تھے...!“ کافی دیر بعد میں کمرے میں آیا تو مہر و نے پوچھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے بال سنوار رہی تھی۔

(جاری ہے)

”ہاں مسرور، دراصل تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میرے بابا سائیں کو ان کے محافظوں سمیت بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پولیس نے ایک آدمی کو گرفتار کیا تھا جس کو اس شخص بارے معلوم تھا جس نے میرے بابا سائیں کو قتل کروایا تھا مگر آج مجھے علم ہوا ہے کہ چند دن پہلے اسے بھی حوالات کے اندر ہی کھانے میں زہر دے کر مار دیا گیا۔ ہم اس وقت شمالی علاقہ جات کی سیر پر تھے اس لیے مٹھل بابا مجھے یہ اطلاع نہیں دے پائے۔ ان کے پاس میرا کوئی رابطہ نمبر ہی نہیں تھا اور میں نے بھی حویلی فون کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”ارے سائیں اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ کا بھلا کوئی کیا لگاڑ سکتا ہے...! آپ تو اس پورے گوٹھ کے وڈیرے ہو۔“ مہرونے کہا اور میرے چہرے پر اس کی سادہ الذہنی کی وجہ سے مسکراہٹ رینگنے لگی۔

”مٹھل بابا کا کہنا ہے کہ میرے جان کو خطرہ ہے، اس لیے مجھے احتیاط کرنی چاہیے۔ رہ گئی وڈیرہ ہونے کی بات تو میرا باپ بھی ایک وڈیرہ تھا۔ جن لوگوں نے سردار سائیں جیسے آدمی پر حملہ کرنے کی جسارت کی ہے، وہ مجھے بھلا کیا حیثیت دیں گے مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ان لوگوں کا مقصد صرف بابا سائیں کو مارنا تھا یا میں بھی ان کا ٹارگٹ ہوں؟ اگر وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں اس کے کافی مواقع ملے تھے مگر مجھ پر ایسے کسی وقت بھی حملہ نہیں ہوا جب میں گوٹھ میں نہ تھا گھومتا رہتا تھا۔ جہاں تک اس اشتہاری کی موت کا تعلق ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسے مارنا ان لوگوں کی مجبوری تھی کیونکہ وہ ان کی نشان دہی کر سکتا تھا مگر اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیا وہ میری جان کے بھی دشمن ہیں یا نہیں...!“ میں نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”سائیں وہ آپ کی جان کے دشمن ہیں یا نہیں مگر پھر بھی احتیاط کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ مٹھل بابا کی نصیحت پر عمل کریں اور محافظوں کے بغیر حویلی سے باہر نہ نکلا کریں۔“ مہرونے فکر مند لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے مگر اب تمہیں بھی احتیاط کرنی ہوگی۔ اگر ان لوگوں کا اگلا ٹارگٹ واقعی میں ہوں تو تم میری بیوی ہونے کی وجہ سے اس آن دیکھے دشمن کی نظر میں ضرور کھٹک رہی ہوگی۔ اس لئے اب کچھ عرصے کے لیے اپنے میکے نہ جاؤ تو بہتر ہوگا۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”سائیں، میرا تو آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ اب آپ نے کہہ دیا ہے تو پھر میں نہیں جاؤں گی۔ ویسے اگر آپ کا دشمن آپ کی جان لینا ہی چاہتا ہے تو آپ کے بدلے میرے جان لے لے... میں آپ پر قربان ہو جاؤں گی۔“

”اچھا! تو تمہیں قربان ہونے کا بڑا شوق ہے...؟“ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”سائیں رات کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی پھر کمال ہوشیاری سے جھکائی دیتے ہوئے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ”میں ذرا دیکھوں کہ کھانے میں آج کیا بنا ہے۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور میں ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

اب میں حویلی سے بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب نکلتا تھا تو مسلح محافظ میرے ہمراہ ہوتے تھے۔ مجھے مٹھل بابا کی یہ بات اب سمجھ میں آگئی تھی کہ جب تک بابا سائیں کے قاتل پکڑے نہیں جاتے، مجھے اپنی حفاظت کا معقول بندوبست کر کے ہی گھر سے نکلنا ہے، ایک دو بار سراج خان سے بھی فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے بھی مجھے احتیاط کا مشورہ دیا تھا۔

مہرونے کے ساتھ میرے زندگی کے ایام بڑے اچھے کٹ رہے تھے۔ میری اور مہرونے کی کہانی بڑی خوبصورت تھی مگر کوئی بھی کہانی اسی وقت تک خوبصورت ہوتی ہے جب تک اس میں شیطان کی انٹری نہیں ہوتی۔ میری کہانی کی خوبصورتی کو بھی اس وقت گرہن لگ گیا جب اس میں شیطان کی انٹری ہوئی۔ میں کوئی عام، دقیانوسی خیالات رکھنے والا انسان نہیں تھا اور نہ ہی شقی القلب تھا مگر تھا تو ایک مرد ہی... میرے ذہن میں بھی شک جیسے زہریلے جذبے نے اپنی جگہ بنا لی۔

میں نے کئی بار نوٹ کیا تھا کہ مہرونے کثرت اوقات کمرے کو بند کر کے فون پر کسی سے بات کیا کرتی تھی۔ شروع شروع میں میں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ایک بار مہرونے سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر فون کرتی ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ اس کی سہیلی اور اس کے درمیان ہونے والی بات چیت کوئی دوسرا سنے۔ سہیلیوں کے درمیان کچھ راز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کے سامنے مناسب نہیں ہوتیں۔ میں اس تاویل سے مطمئن ہو گیا تھا مگر ایک دن کے واقعہ نے میرے دل کی خشک مٹی میں بھی شک کا بیج بو دیا۔

ایک دن میں ڈرائنگ روم سے کچھ مہمانوں کو رخصت کر کے اپنے کمرے لوٹا اور دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹھک گیا۔ مہرونے کی باتیں کرنے کی ہلکی سی آواز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی اسی سہیلی کے ساتھ بات کر رہی ہے جس کے بارے میں اس نے مجھے بتایا تھا۔ اگرچہ میں نے دروازے کا ہینڈل گھما کر چیک نہیں کیا تھا تاہم مجھے اندازہ تھا کہ اس نے حسب معمول دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہوگا۔ میں واپسی کے لئے مڑا مگر پھر رک گیا۔ آخر وہ کون سی سہیلی تھی جس کی اتنی پردہ داری تھی کہ میرے سامنے بھی اُس سے بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے اُس پاس کا جائزہ لیا۔

اس وقت وہاں حویلی کا کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیے۔ مہرونے کی مدھم سی آواز کچھ واضح ہو گئی تھی۔ اگرچہ کسی کی باتیں یوں چھپ کر سننا ایک معیوب حرکت تھی اور مجھے اس بات سے دل ہی دل میں کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی کہ میں اپنی اس بیوی کی باتیں چوری چھپے سننے کی کوشش کر رہا ہوں جس پر شاید مجھے خود سے زیادہ اعتبار تھا مگر اس وقت شاید میرے اندر کے روایتی مرد نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کان لگا کر سننے کے باوجود مجھے کچھ واضح طور پر سنائی نہیں دے رہا تھا تاہم کچھ الفاظ سمجھ میں آئے۔ ”جی سائیں میں سمجھ رہی ہوں۔“ مہرونے سے کہہ رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے حویلی کا ایک ملازم ادھر آتا ہوا دکھائی دیا تو میں دروازے سے دور ہو گیا اور ٹھٹھکے ہوئے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی میں نے پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

”سائیں...“ وہ یہ لفظ کس کے لیے استعمال کر رہی تھی؟ وہ سائیں کہہ کر تو مجھے مخاطب کیا کرتی تھی پھر وہ کون تھا جس کے لئے اُس نے سائیں کا صیغہ استعمال کیا تھا۔

مہرونے کا عشق تھی اور عشق میں سب سے زیادہ اہمیت اعتمادی ہوتی ہے۔ مجھے بھی اس پر بہت اعتبار تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار ہو۔ ہمارے گوٹھ میں سائیں کا لقب صرف شہریوں کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ محترم شخصیات کو بھی اس طرح مخاطب کیا جاتا تھا، جیسے چچا سائیں، تایا سائیں... مگر وہ صرف سائیں کہہ رہی تھی۔

میرے ذہن میں شیطانی وسوسہ سازی شروع ہو گئی۔ میں اپنے ذہن میں ابھرنے والے شیطانی وسوسوں اور اندیشوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ مہرونے کا پیار بناوٹی نہیں تھا۔ وہ تو میری ذرا سی طبیعت خراب ہونے پر پریشان ہو جاتی تھی پھر مجھ سے بے وفائی کی مر تکب کیسے ہو سکتی تھی؟ مگر پھر بھی تسلی کر لینا ضروری تھا۔ مہرونے مجھے کہا تھا کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے باتیں کرتی ہے مگر سائیں کا صیغہ کسی صنف نازک کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ دروازہ بند کر کے کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی مگر کس سے... یہ جاننا اب میرے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ اگلا فون کب کرے گی مگر میں اس کا فون سننے کا بندوبست کر سکتا تھا۔ اس کے لئے مجھے زیادہ تنگ و دو کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹے سے کیسٹ پلیئر کا بندوبست کرنا تھا۔ جس کے بعد میں مہرونے کی تمام فون کالز کی ریکارڈنگ سن سکتا تھا تاہم میرے گھر میں شاید کوئی ایسا کیسٹ پلیئر موجود نہیں تھا۔ میری بے صبری کا یہ عالم تھا کہ میں دیر کئے بغیر اپنے گاڑی نکال کر حویلی سے روانہ ہو گیا۔ مٹھل بابا باہر موجود نہیں تھے۔ میں عجلت میں مسلح محافظوں کے بغیر ہی روانہ ہو گیا تھا۔ میری اس اچانک روانگی پر گیٹ پر موجود محافظوں میں افرا تفری مچ گئی تھی۔ وہ سب بھی تیزی سے ساتھ جانے کے لئے حرکت میں آئے تھے مگر میں کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی گاڑی بھگتا ہوا حویلی سے دور ہوتا چلا گیا۔

مہرونے کچھ باتیں سننے کے بعد میرے دل میں آگ سی لگی تھی اور اس آگ کو بجھانے کے لئے بہت ضروری تھا کہ میں اس فون والے سائیں کی شخصیت سے آگاہ ہو جاتا۔ میری واپسی تقریباً پانچ گھنٹوں کے بعد ہوئی تھی۔ اپنا مطلوبہ سامان حاصل کرنے کے لئے مجھے شہر جانا پڑا تھا تاہم جب میں واپس آیا تو اپنے مطلب کا تمام سامان حاصل کر چکا تھا۔ میری گاڑی حویلی کے مین گیٹ پر پہنچی تو وہاں مٹھل بابا دیگر مسلح محافظوں کے ہمراہ موجود تھے۔ تاہم میں نے گاڑی سے اترنے کی بجائے ہارن دیا تو دربان نے جلدی سے گیٹ کھول دیا اور میں گاڑی حویلی کے اندر لے گیا۔ میں اس وقت مٹھل بابا سے اس بحث کے موڈ میں نہیں تھا کہ میں آج محافظوں کے بغیر حویلی سے کیوں گیا تھا۔ میرے ذہن پر وہ سائیں کی آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا جس سے مہرونے پر بات کر رہی تھی۔

میں نے گاڑی سے سامان کا شاپر نکالا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ مہرونے شاید کمرے میں تھی، ویسے بھی وہ کمرے سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔ میں نے اپنے مواصلاتی آلات کا شاپر ڈرائنگ روم میں موجود میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اب مجھے رات کے وقت اس کو کمرے میں موجود فون کے ساتھ منسلک کرنا تھا۔ بس اتنی احتیاط کرنا تھی کہ کیسٹ پلیئر کی تار کو فون کے کی تار کے ساتھ منسلک کر کے کسی ایسی جگہ چھپانا تھا جہاں مسرور کی نظر براہ راست نہ پڑ سکے۔ وہ بالکل جاہل لڑکی نہیں تھی۔ اس نے آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں۔ وہ اخبار وغیرہ بھی پڑھ لیتی تھی اور کبھی کبھی مجھے خبریں پڑھ کر بھی سنایا کرتی تھی۔ میں اس سے اخبار پڑھنے کی فرمائش خبریں سننے کے لیے نہیں بلکہ اس کی گلابی اردو سننے کے لیے کرتا تھا۔ اس نے آٹھویں جماعت کا امتحان نہ جانے کیسے پاس کر لیا تھا اور نہ اردو پڑھنے میں اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

میں آلات کی خریداری کرتے وقت اسے استعمال کرنے کا طریقہ سیکھ کر آیا تھا۔ میرا ارادہ اپنی ڈیوائس کو رات کے وقت کمرے کے فون سے منسلک کرنے کا تھا تاہم وہ موقع مجھے فوراً ہی مل گیا کیونکہ اسی وقت مہرونے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”سائیں! آپ کہاں تھے؟ کیا کہیں گئے ہوئے تھے...!“ اس نے پوچھا۔

”ہاں میں ذرا ایک کام کے سلسلے میں باہر گیا تھا۔ یہ خانساں کہاں ہے؟ میرا چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”خانساں کو بہت تیز بخار تھا، میں نے اسے آج چھٹی دے دی ہے۔ میں آپ کے لئے خود چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

مہرونے کسی خدمت گزار بیوی کی طرح کہا اور تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔ جیسے ہی وہ میری نگاہوں سے اوچھل ہوئی میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دراز سے شاپر نکال کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مہرونے کو چائے بنانے میں کچھ منٹ لگ جانے تھے اور میرے لئے اتنا وقت کافی تھا۔

اپنے کمرے میں آتے ہی میں نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور فون کے پاس آ گیا۔ کیسٹ پلیئر کی تار کی جیک پن کو فون کے ساکٹ سے منسلک کرنے میں مجھے بہت تھوڑا وقت لگا۔ شاید یہ ڈیوائس اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ اسے ایمر جنسی میں کسی بھی وقت استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اُس دور کی یہ شاید اس مقصد کے لئے استعمال ہونے والی سب سے جدید ڈیوائس تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بٹن تھا جو میں نے فون کے ریسیور کو کھول کر اس کے اندر فٹ کر دیا تھا۔ اس بٹن کی مدد سے اب فون کی آواز ساکٹ میں منسلک تار کے ذریعے کیسٹ پلیئر میں منتقل ہوتی رہتی تاہم اس میں صرف چوبیس گھنٹے تک ریکارڈنگ کی گنجائش تھی، اس لیے مجھے روزانہ کی بنیاد پر اسے ریورس کر کے دوبارہ چلانا تھا، اس طرح میں ہر روز ریکارڈ ہونے والی کالز سن بھی سکتا تھا اور اس ریکارڈنگ کو ڈیلیٹ بھی کر سکتا تھا۔ کام مکمل کرنے کے بعد میں نے کیسٹ پلیئر آن کر کے فون ریک کے نیچے موجود قالین کے نیچے چھپا دیا۔ اس کی تار زیادہ لمبی نہیں تھی اس لیے اسے فون سے زیادہ دوری پر نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ویسے جس جگہ میں نے اسے چھپایا تھا وہاں مہرونے کی نگاہیں نہیں جاسکتی تھیں۔

مجھے اس ساری کارروائی میں چار سے پانچ منٹ لگے تھے۔ میں کمرے سے باہر نکل کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مہرونے ابھی تک کچن میں ہی تھی۔ میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچن سے نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو کپ موجود تھے۔ ایک کپ اس نے میرے سامنے ٹیبل پر رکھا اور پھر خود بھی صوفے پر بیٹھ کر چائے کی چمکیاں لینے لگی۔

(جاری ہے)

قسط : 4

شاكر لطيف



”سائیں! مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مہر بولی۔

”کہو! کیا بات ہے؟“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”سائیں کافی عرصہ ہو گیا ہے، میں اپنے گھر سے ہو کر نہیں آئی۔ سوچ رہی ہوں ایک دو دن کے لیے ہو آؤں۔“ مہر نے کہا۔

”میں نے اپنے انجان دشمنوں کی وجہ سے تمہیں وہاں جانے سے منع کیا تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ویسے اگر تم چاہو تو اپنی ماں اور بہنوں کو یہاں بلا لو۔“

”نہیں سائیں، یہ مناسب نہیں اور پھر مجھے اپنی کچھ سہیلیوں سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ بس ایک دن کے لیے جانے کی اجازت دے دیں۔“ وہ بولی۔

”کیا اس سہیلی سے ملنے کی بے چینی ہے جس سے تم دروازہ بند کر کے اکثر بات کیا کرتی ہو؟“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ مہر نے یوں گہرا کر میری جانب دیکھا جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو، تاہم میں نے اپنا چہرہ بالکل سہل کر رکھا۔

وہ کچھ دیر تک بغور میرے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ”ہاں سائیں اس سے بھی ملنا ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم چاہو تو آج جا سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”مگر سائیں! اب تو شام ہونے والی ہے۔۔۔“ وہ تذبذب زدہ لہجے میں بولی۔

”تو کیا ہوا!۔۔۔!“ میں نے کہا۔ ”یہں تمہیں چھوڑنے نہ جاؤں گا، اس لیے مٹھل بابا کے ساتھ چلی جاؤ۔ ابھی وہ تمہیں چھوڑ آئیں گے اور کل دوپہر کو واپس لے آئیں گے۔ فی الحال یہں سنیں چاہتا کہ تم وہاں زیادہ وقت گزاریں۔“

”آپ مجھے چھوڑنے نہیں جائیں گے؟“ وہ ہلکی سی حیرت سے بولی۔

”مجھے زمین کے سلسلے میں کچھ کام ہے اس لیے میں ایک دو دن تک فارغ نہیں ہوں۔ اگر تم ایک دو دن انتظار کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں سائیں میں آج ہی جاؤں گی۔“ مہر نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ مٹھل بابا کو گاڑی نکالنے کا کہہ دیں، میں تیار ہو جاؤں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ میں خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے جانے کی جلدی میں آدھی چائے پی تھی۔ کیا اسے اس فون والے سائیں سے ملنے کی اتنی ہی جلدی تھی...؟

میں سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔ میرا رخ حویلی کے گیٹ کی جانب تھا۔ میری نگاہیں مٹھل بابا کو تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ مجھے دکھائی دے گئے۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں ایک طرف لے گیا۔ میرے طرز عمل پر ان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات عود آئے۔ تاہم وہ اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ میں ان سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔

”مٹھل بابا! مہر نے ابھی اپنے میکے جانا ہے اور آپ نے اسے چھوڑنے جانا ہے۔“ مٹھل بابا نے اثبات میں سر ہلادیا تاہم ساتھ ہی وہ متحسّس نگاہوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ”بابا، میں ایک کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ اگر ہو سکے تو مہر کو چھوڑ کر آپ نے واپس نہیں آنا۔ آپ نے یہ دیکھنا ہے کہ مہر اپنے گھر کے علاوہ اور کہاں کہاں جاتی ہے؟ سیدھے لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ آپ کو اس کی نگرانی کرنی ہے۔“

وہ کچھ دیر تک مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ”نادر سائیں! شک اور بدگمانی نے بڑے ہنستے ہنستے گھر تباہ کر ڈالے ہیں۔ آپ نے مہر کو بیٹی میں ایسا کیا دیکھ لیا جو ان کی نگرانی کروانے کی ضرورت پیش آگئی ہے؟“

”مٹھل بابا! مہر بانی کر کے اس وقت مجھ سے نہ پوچھیں، بس مجھے اتنا بتادیں کہ آپ یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں؟“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”نگرانی کا کام میرے لئے نیا نہیں ہے۔ آپ کے والد سردار سائیں کے بعض دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے میں نے پوری پوری رات کماؤں کے کھیتوں میں چھپ کر جاگتے ہوئے گزاری ہے یہاں تو صرف نگرانی کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے مٹھل بابا۔ آپ کچھ دیر بعد مہر کے ہمراہ روانہ ہو جائیں۔“ میں نے مزید بحث کی بجائے سر ہلاتے ہوئے کہا اور دوبارہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ مہر ابھی تک اپنے کمرے میں ہی تھی۔ اس کی آمد تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔

”سائیں! کیا میں جاؤں؟ پہلے ہی شام ہونے والی ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں آؤ میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ دوں۔ کل دوپہر کو مٹھل بابا تمہیں لینے آجائیں گے، اس سے زیادہ وقت وہاں مت گزارنا۔“ یہ کہتے ہوئے میں حویلی کے پھانک کی طرف بڑھ گیا۔

مٹھل بابا گاڑی کے ساتھ وہاں ہمارے منتظر تھے۔ میں نے مہر کو روانہ کیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ ابھی مجھے فون کے ساتھ کیسٹ پلیئر منسلک کیے زیادہ دیر نہیں گزری تھی مگر پھر بھی مجھے گمان گزرا تھا کہ مہر نے شاید جانے سے پہلے ”سائیں“ کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی ہو۔ اس نے کمرے میں کافی وقت صرف کیا تھا، محض لباس بدلنے میں اتنی دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ جس کو وہ فون کرتی تھی، اس کا تعلق اس کے گوتھ سے ہی ہو گا اور وہ اگر اسی سے ملنے جا رہی تھی تو پھر ایک بار اسے اپنی آمد کی اطلاع تو ضرور دے گی۔ میری بدگمانی رفتہ رفتہ اپنے عروج کی طرف گامزن تھی۔ میرے اندر کاروائی مرداب پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ کیسٹ پلیئر نصب کر کے میں نے بس ہوا میں تیر چھوڑا تھا مگر میرا یہ تیر اس قدر درست نشانے پر بیٹھ گیا کہ شاید میرے اپنے وہم گمان میں بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی انسان کا کوئی فیصلہ بڑا بروقت ثابت ہوتا ہے۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں آکر میں نے قالین کے نیچے چھپایا ہوا ویڈیو پلیئر نکال کر اس کی تار کو ساکٹ سے الگ کیا۔ اب میں اس میں ریکارڈ ہونے والے کال سن سکتا تھا۔ کافی دیر تک اس میں سے شائیں شائیں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی رہی کیونکہ اس ڈیوائس کو فکس کیے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے فارورڈ کے بٹن کو پریس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر مہر نے جانے سے پہلے واقعی کوئی فون کیا تھا تو اس کا کچھ ہی دیر میں پتا چل جائے گا اور پھر کیسٹ پلیئر میں یکدم گھٹی کی آواز گونجی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کال ریسرو کرنے والے کی آواز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مہر نے ہی کال کی تھی۔ اگلے جملے سے میرے گمان کی تصدیق بھی ہو گئی۔

”ہیں مسر بول رہی ہوں۔ اگر سائیں شہباز گھر پر موجود ہیں تو میری ان سے فوراً بات کراؤ۔“ مہر کی آواز سنائی دی تو میرے دل کی دھڑکن یکلخت بے ترتیب ہو گئی۔ ریکارڈنگ میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر شہباز کی آواز گونجی۔

”ہیلو! مہر فون کرنے سے پہلے تسلی کر لی ہے نا! نادر تو تمہارے آس پاس نہیں ہے؟“

”جی سائیں! تسلی کر کے ہی آپ کو فون کیا ہے۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں گوتھ آ جاؤں۔ میں بس مٹھل بابا کے ساتھ روانہ ہو رہی ہوں اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔ آپ کچھلے فون پر بھی میرے نہ آنے پر ناراض ہو رہے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم آج ہی کچھ دیر کے لیے مجھ سے مل لینا۔ میرا خیال ہے کہ اب نادر سائیں کا کام تمام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کروائی تھی۔ میں نے اس کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے بڑا رسک لیا ہے ورنہ سردار سائیں جیسے آدمی کو قتل کروانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے اسے قتل کروانے کے بعد خاصی مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ ایس پی سراج خان مجھے شامل تفتیش کرنے پر تل گیا تھا۔ وہ تو نادر ہی نرا اگھا مڑ ثابت ہوا۔ اس نے مجھ پر شک کا اظہار ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے سراج خان مجھے گرفتار نہیں کر سکا۔ میں نادر کو مارے بغیر اس جائیداد پر قبضہ نہیں کر سکتا مگر سردار سائیں کے قتل کے بعد پو لیس پہلے مجھ پر نظر پڑی۔

مروڑیہ ہوئے تھی ایسے میں، میں نادر کو قتل کروانا تو وہ مٹھل بابا ایف آئی آر میں میرا نام شامل کروا دیتا۔ میں نے جائیداد کے لیے نادر کو بھی اپنے گلے سے لگا لیا حالانکہ میں بھی اپنے باپ کی طرح تباہ سائیں اور ان کے بیٹے سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ نادر کے باپ نے میرے باپ کا حق مارا تھا۔ مہر! تو میری بات سن رہی ہے؟“ شہباز کی آواز سنائی دی۔

”ہاں میرے سائیں! میں سن رہی ہوں۔“ مہر کا جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جسم پر غصے سے کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔

”تو پھر سنو! آج جب تم اپنے گھر آؤ گی تو مجھ سے ملنے چلی آنا۔ میں تمہیں ایک خاص قسم کا زہر دوں گا۔ تم نے یہ زہر نادر کی چائے میں ملا نا ہے۔ اس زہر میں یہ خاصیت ہے کہ یہ بے بو اور بے رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ظاہر نہیں ہوتا۔ معدے میں جاتے ہی دس منٹ کے بعد انسان کو دل کا شدید دورہ پڑتا ہے جس کے بعد وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اب نادر کے مرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد کا کچھ حصہ بیوہ ہونے کے ناتے تمہیں بھی ملے گا، زیادہ حصہ مجھے ملے گا۔ تمہارا حصہ میں بعد میں اپنے نام کروالوں گا۔ سمجھ گئی ہو نا میری بات...!“

”جی سائیں، سمجھ گئی۔“ مہر نے جواب دیا۔ ”باہر نادر سائیں موجود ہیں، ادھر بھی آ سکتے ہیں۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔“ پھر ہلکے سے ٹھٹھکی کی آواز سنائی دی اور دوبارہ شائیں شائیں کی آواز گونجنے لگی۔ میں نے اس کا بٹن آف کر دیا۔ اب مجھے مزید کچھ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک محاورہ برسوں پہلے کہیں سنا تھا ”سنتا جاشر مانتا جا...“ مجھے اس کی صحیح سمجھ آج آئی تھی۔

میں نے ایک شک کو دور کرنے کے لیے اس کا فون ٹیپ کرنے کا انتظام کیا تھا مگر مجھے ہر گز بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ پہلی ہی کال سننے پر مجھ پر کس قدر ہولناک انکشافات ہوں گے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ میں قسمت کا دشمن تھا۔ اگر یہ نہ یہ ریکارڈنگ نہ سنی ہوتی تو کل مہر کے واپس آنے پر خاموشی سے دل کا دورہ پڑنے پر ملک عدم سدھار چکا ہوتا۔ مہر کا خیال آتے ہی میرے بدن میں خون پارے کی طرح دوڑنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا انتخاب اس قدر گھٹیا ہو گا۔ وہ تو یہاں کسی اور ہی مقصد کے لیے آئی تھی۔ دوسری طرف شہباز نے بھی مجھے ششدر کر دیا تھا۔ وہ اتفاق یا خوش قسمتی سے مجھے اس کی سازش کا عین وقت پر علم ہو گیا ورنہ وہ تو مجھے قبر میں اتارنے کا پورا بندوبست کر چکا تھا۔ میری بیوی، جسے میں بڑے مان سے بیاہ کر لایا تھا وہ اس کی رکھیل تھی۔ اس کی مجھ سے محبت، میرے لیے ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جانا، وہ سب ایک دھوکے اور بناوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

مجھ پر سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ مٹھل بابا کے خیالات درست تھے۔ آج تک میں ان کی شہباز کے متعلق رائے کو ان کی ذاتی پر خاش اور بابا سائیں کے زمانے سے جاری دشمنی کا شاخسانہ سمجھتا رہا مگر آج ان کی تمام باتیں درست ثابت ہوئیں تھیں۔ میں نے انہیں خود مہر کی نگرانی کرنے کے لیے بھیجا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ جب وہ اس کو شہباز کی حویلی میں جاتے دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے...! بہر حال ان کی واپسی کل متوقع تھی اور میرے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے آج کی پوری رات پڑی تھی۔ یہ بات تو حقیقت پر مبنی تھی کہ میرے اندر بھی ایک وڈیرے کا خون تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اس رات میں ایک وڈیرے کی طرح ہی سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے مہر سے نمٹنا تھا اور اس کے بعد شہباز کو بھی اس کے کرتوتوں کی سزا دینی تھی۔ یہ واضح ہونے کے بعد کہ میرے بابا سائیں کا قتل اسی نے کروایا تھا، وہ کسی قسم کے رحم یا رعایت کا مستحق نہیں رہا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے طویل اور اذیت ناک رات تھی۔ وہ رات میں نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ صبح کے قریب میری آنکھ لگی لگی مگر ذہنی دباؤ کی وجہ سے دو تین گھنٹوں بعد ہی میں بیدار ہو گیا۔ اس وقت صبح کے نوبے تھے۔ تین چار بجے سے پہلے مہر اور مٹھل بابا کی آمد متوقع نہیں تھی۔ میں نے کیسٹ پلیئر اٹھایا اور ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں خانساں نے میرے سامنے ناشتہ رکھ دیا جسے میں نے زہر مار کیا۔ مجھے اب بس مہر کا انتظار تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے چائے کب اور کیسے پیش کرتی ہے۔ میری محبوب بیوی مجھے مارنے کے لیے زہر لے کر آرہی تھی۔ اس کو کچھ پروٹوکول تو دینا ہی تھا۔ انتظار کے لمحے اگرچہ طویل تھے تاہم کٹ گئے۔

تقریباً تین بجے کے قریب مجھے حویلی کا پھانک کھلنے اور کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ گویا مہر و آگئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اندر داخل ہوئی۔ مٹھل بابا باہر ہی رہ گئے تھے مگر میں جانتا تھا کہ مہر کے جاتے ہی وہ مجھے رپورٹ دینے اندر ضرور آئیں گے۔ میں نے بغور مہر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی اور چہرے پر عجیب سی پشیمانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک عورت تھی اور آج مجھے زہر دے کر مارنے والی تھی اس لیے اس کا خوف زدہ ہونا فطری سی بات تھی مگر شاید میرے چہرے پر کچھ زیادہ ہی وحشت طاری تھی۔

”سائیں! کیا ہوا ہے آپ کو...! آپ کی آنکھیں اتنی لال کیوں ہیں؟“ وہ مجھے دیکھ کر پریشان سے لہجے میں بولی۔

”کچھ نہیں، ذرا سر میں درد ہے۔ ابھی چائے پیوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ میں نے دانستہ چائے کا ذکر کیا۔

”تو خانساں کو کہہ دیتے، وہ چائے بنا دیتا۔“ وہ بولی۔ ”خیر! میں آگئی ہوں اب، میں اپنے سائیں کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دوں گی۔ پہلے ذرا میں کپڑے تبدیل کر لوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کی جانب چلی گئی۔ میں خاموشی سے اسے راہداری میں جاتے دیکھتا رہا۔ کتنی جلدی تھی اسے مجھے زہر ملی چائے پلانے کی...!

اسی لمحے مٹھل بابا اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات موجود تھے

”جو کہنا ہے، کہہ ڈالیں۔ مہر اپنے کمرے میں جا چکی ہے اور ہمارا کمرہ اتنی دوری پر ہے کہ وہاں تک آپ کی آواز نہیں جائے گی۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آپ کہنا چاہتے ہیں۔ مہر شہباز کے گھر گئی تھی۔ یہی بتانا چاہتے ہیں نا آپ...!“

میں نے کہا تو مٹھل بابا کے چہرے پر حیرت کے تاثرات عود آئے۔ ”مٹھل بابا! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ مجھے وہ بھی معلوم ہو گیا ہے جو شاید ابھی آپ کو بھی نہیں معلوم۔ آپ درست کہتے تھے کہ شہباز ہی نے میرے والد کو قتل کروایا ہے اور یہ مہر... یہ بھی اس کی آگے کار ہے۔“ میں نے مختصر آواز مہر اور شہباز کے درمیان ہونے والی فون ریکارڈنگ کے چیدہ چیدہ نکات سے آگاہ کیا تو ان کے چہرے کے عضلات غصے سے پھڑکنے لگے۔

(جاری ہے)

”آپ نے واقعی مجھ پر بہت ہولناک انکشاف کیے ہیں نادرسائیں۔ میں نے مہرو کو شہباز کی حویلی جاتے ضرور دیکھا تھا مگر میں اس بارے میں متذبذب کا شکار تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شہباز کی بجائے اس کے کسی ملازم کی بیٹی سے ملنے گئی ہو۔ شہباز کی حویلی میں ملازمین کے لیے کوارٹروں وغیرہ بھی بنے ہوئے ہیں جیسے ہماری حویلی میں بھی ہیں مگر آپ نے جو کچھ بتایا ہے، اس نے میرے روٹے کھڑے کر دیے ہیں۔ شہباز اس قدر شاطر انسان ہو سکتا ہے... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ انسان کے روپ میں ایک شیطان ہے اور مہرو... اس نے تو گھٹیا پن کی ہر حد پار کر دی ہے۔ بہر حال اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ شہباز کو بھی دیکھ لیں گے لیکن پہلے آپ مہرو کے بارے میں فیصلہ کر لیں۔

”مٹھل بابا نے غصیلے لہجے میں کہا۔
 ”مٹھل بابا! آپ کے پاس ایک ریوالور ہمیشہ رہتا ہے، وہ مجھے دے دیں۔“ میں نے کہا تو انہوں نے لمحہ بھر کے لیے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے کرتے کے نیچے بندھے چمڑے کی بیلٹ سے ریوالور نکال کر مجھے دے دیا جسے میں نے سامنے موجود ٹیبل کی دراز میں منتقل کر دیا۔ ”اب آپ ہمارے آبائی قبرستان میں ایک قبر بھی تیار کروالیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں عورتوں کی تدفین ان کی موت کے ساتھ ہی کر دی جاتی ہے۔“ میں نے سر دھجے میں کہا۔

”بالآخر آپ کے اندر کا ڈیرا بھی جاگ ہی گیا نادرسائیں۔ آج مجھے پہلی بار آپ کے اندر سردار سائیں کی جھلک نظر آئی ہے۔ وہ بھی دشمنوں اور دغا بازوں کو قبر کے سپرد کرنے کے عادی تھے۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ مہرو آپ کو مارنے کے لیے شہباز سے کوئی زہر لے کر آ رہی ہے تو میرے صبر کا پیمانہ شاید راستے میں ہی لبریز ہو جاتا اور میں اسے گولی مارنے پر مجبور ہو جاتا۔“ مٹھل بابا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”اس کی موت تو اب لکھی جا چکی ہے، مگر اسے مارنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مجھ پر اس کی بے وفائی کا راز افشا ہو چکا ہے۔ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ قبر تیار کرنے کا بندوبست کریں اور اگر بعد میں معاملہ پولیس تک گیا تو سنبھال لیجیے گا۔ مہرو کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔“

”آپ بے فکر ہیں نادرسائیں، کسی وڈیرے کی عورت کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے والد مرد تھے اس لیے میں نے آپ کے کہنے پر ان کے پوسٹ مارٹم کی اجازت دے دی تھی مگر مہرو چاہے ایک دغا باز عورت ہی ہے مگر بہر حال آپ کی بیوی کی حیثیت سے ہی دفن ہوگی۔ اس بارے میں پورے گوٹھ میں مشہور کر دیا جائے گا کہ اس کی موت فرش پر پاؤں پھسلنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں قبر تیار کروانا ہوں۔ آپ نے جو کرنا ہے، کر لیں، اس کے بعد شہباز کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ اس کی قبر بھی تو ہمیں ہی تیار کرنی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے مٹھل بابا واپس مڑ گئے جبکہ میں اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہا۔ میں بظاہر پرسکون تھا مگر میرے اندر ایک طوفان برپا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد مہرو کی آمد ہوئی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے سرخ رنگ کا وہ جوڑا پہن رکھا تھا جو اس دن پہنا تھا جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی معصومیت اور خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا مگر اب میں اس حسین چہرے کو دیکھ کر دھوکہ نہیں کھا سکتا تھا۔ اب میں جان چکا تھا کہ بظاہر معصوم دکھائی دینے والے چہرے کے پیچھے ایک کریہہ شکل چھپی ہے۔

”سائیں معاف کیجیے گا، مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ میں ابھی آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے، زہر ملی چائے بنا کر لائے۔ ذرا دیکھوں تو صحیح کے وہ کس حد تک گر سکتی ہے۔ نفرت کی ایک تیز لہر نے میرے پورے وجود کو اپنی پلٹ میں لے لیا۔ میں نے جس عورت سے محبت کی تھی اور جسے اپنانے کے لیے اپنے خاندان میں رائج صدیوں پرانے رسم رواج تک توڑ ڈالے تھے، وہ کتنی آسانی سے مجھے موت کے سپرد کرنے والی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جو موت وہ مجھے دینے کی متنی تھی وہ اس کے اپنے سر پر منڈلا رہی تھی۔ آج اس کی ملاقات نادرسائیں سے نہیں بلکہ وڈیرے نادرسائیں سے ہونے والی تھی۔ آج وہ میرا وہ روپ دیکھنے والی تھی جو آج سے پہلے اس نے دیکھا تو کیا شاید سوچا بھی نہ تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے کپ میرے سامنے رکھا اور پھر خود میرے سامنے بیٹھ کر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”سائیں آج آپ کے ساتھ بیٹھ کر یہ چائے پینا بہت انمول ہے، شاید یہ لمحے دوبارہ نصیب نہ ہوں۔“

”اچھا...“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”آج سے پہلے بھی تو ہم نے ایک ساتھ کئی بار چائے پی ہے، پھر آج کی اس چائے میں کیا منفرد ہے؟“

”سمجھ جائیں گے سائیں! پانچ دس منٹ میں سب سمجھ جائیں گے۔“ وہ میرے طنز کو سمجھے بغیر رسائی سے بولی۔ ”سائیں انسان کی زندگی بھی بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی کبھی اسے ایسے فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں جو عام حالات میں شاید سوچ بھی نہیں سکتا۔“ بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ چائے کے گھونٹ بھی لیتی جا رہی تھی تاہم میں نے اپنے سامنے موجود چائے کے کپ کو ابھی تک چھوا بھی نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کپ میں وہ زہر ملا ہوا تھا جو وہ اپنے عاشق شہباز سے لے کر آئی تھی۔

”ہاں مسرو، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ انسان کو اپنی زندگی میں واقعی بسا اوقات بڑے عجیب فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں۔“ میں نے ٹیبل کی دراز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، جس میں ریوالور موجود تھا۔

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک پر خیال نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”سائیں آپ چائے کیوں نہیں پی رہے؟ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”میرا خیال ہے کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔“ میں نے پھینکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مہرو اپنی چائے ختم کر چکی تھی۔ اس نے اپنا کپ میز پر رکھا اور آگے بڑھ کر میرا کپ اٹھالیا۔

”نہیں سائیں چائے تو ابھی گرم ہی ہے۔“ وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”آپ کا شاید موڈ نہیں ہے، چلیں، یہ بھی میں پی لیتی ہوں“ وہ گھونٹ بہ گھونٹ چائے اپنے حلق میں اتارنے لگی۔

اس کی اس حرکت سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مہرو نے میری چائے میں زہر ملا یا تھا مگر وہ جس طرح میرے حصے کی چائے پی رہی تھی، اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ”شاید وہ رات کی چائے پر یہ کام کرنا چاہتی تھی۔“ میں نے سوچا، مگر میں رات تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سینے میں جو آگ لگی ہوئی تھی اسے فوری ٹھنڈا کرنا ضروری تھا۔ مہرو کی بے وفائی اور دغا بازی مجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے میری موت کا پلان کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیا تھا تاہم میں نے اس کی موت کا پلان ملتوی نہیں کیا تھا۔ اب اس سے دو ٹوک بات کرنا ضروری ہو گیا تھا، میں نے اپنی جیب سے کیسٹ پیلیئر نکالا اور میز پر رکھ کر اس کا بٹن آن کر دیا۔ مہرو حیرت کھینچے انداز میں کیسٹ پیلیئر کو دیکھ رہی تھی مگر جیسے ہی اس میں سے آواز ابھری وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں سے چائے کا کپ بھی زمین پر جا گرا، چہرے پر یک بیک سراسیمگی کے تاثرات عود آئے مگر وہ کچھ بولی نہیں، خاموشی سے ریکارڈنگ سننے لگی۔

میں نے نے میز کی دراز سے ریوالور نکال لیا اور خونخوار نگاہوں سے مہرو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ دراز سے ریوالور نکالنے پر مہرو نے کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو میں نے کیسٹ پیلیئر اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور ریوالور کا رخ مہرو کی جانب کر دیا۔

”دغا باز عورت...! میں نے تجھے کس قدر خلوص سے چاہا تھا اور تو نے مجھ سے بے وفائی کی... دھوکہ کیا...“

”نہ سائیں نہ! بے وفائی کا طعنہ مجھ کو مت دو۔ بس مجھے مارنے سے پہلے میری بات سن لو۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔“ وہ ملتی جلتی لہجے میں بولی۔

”نہیں مہرو! وقت تھوڑا نہیں ہے۔ تم جو زہر شہباز سے لے کر آئی ہو، وہ تو ابھی تک میرے معدے میں گہا ہی نہیں ہے۔ اور تم نے میری چائے جس طرح پی، اس سے بھی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی تم نے میری چائے میں زہر نہیں ملا یا۔ شاید تم رات کو یہ کام کرنا چاہتی تھی۔“

”نہیں سائیں، میں جو کرنا چاہتی تھی، ابھی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا نا کہ وقت بہت تھوڑا ہے۔ میں نے چائے میں زہر بھی ملا دیا تھا مگر... آپ کی چائے میں نہیں، اپنی چائے میں۔“

”کیا...! تم نے اپنی چائے میں زہر ملا دیا؟“ میں نے متحیر لہجے میں کہا۔ مہرو کے اس جواب سے مجھے ذہنی طور پر جھٹکا لگا تھا۔ وہ بھلا زہر خود کیوں پینے لگی...! شاید پھر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سائیں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ سن لو میری بات۔ میں اپنی چائے میں زہر اس لئے ملا یا ہے کہ میں اپنے نادرسائیں کو نہیں مار سکتی تھی اس لئے میں نے خود کو مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ عورت کبھی دغا باز یا بے وفائ نہیں ہوتی۔ عورت بس مجبور ہوتی ہے۔ میں بھی مجبور تھی سائیں۔ آپ کو پہلی ملاقات تو یاد ہے سائیں! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ صرف آپ کو ہی مجھ سے پیار ہوا تھا...! نہیں سائیں۔ اس لمحہ بھر کی ملاقات میں مجھے بھی آپ سے پیار ہو گیا تھا۔ میرے راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی، پھر آپ کا رشتہ آیا تو معلوم ہوا کہ یہ آگ یک طرفہ نہیں تھی اور یوں میرے آپ سے شادی ہو گئی۔ سائیں یہ شادی شہباز کی مرضی سے ہی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کامیری آپ کے ساتھ شادی کروانا ایک سازش تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اس کی رکھیل ہوں مگر یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ آپ کو میرے بے وفائی تو دکھائی دے گئی مگر میری مجبوری آپ کی نگاہوں سے اوچھل ہی رہیں۔ جانتے ہیں سائیں!

میرے باپ کی وفات نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے شہباز کے والد وڈیرے گل باز نے قتل کر دیا تھا۔ صرف اس شک کی وجہ سے کہ میرا باپ اس کے زمینوں کے آمدن کے حساب میں گڑ بڑ کر رہا تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے وڈیرے کے اس الزام پر اس سے ثبوت مانگنے کی جسارت کی تھی۔

میرے باپ کی موت یا قتل کے بعد ہم لوگ بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وڈیرے گل باز کی گندی نظر مجھ پر تھی اور ساتھ ہی اس کے بیٹے شہباز کی بھی... مگر شہباز میرے معاملے میں زیادہ گھٹیا ثابت ہوا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ آپ کے چچا سائیں کی موت طبعی ہے، نہیں سائیں! انہیں بھی کسی ایسے ہی زہر کا نشانہ بنایا گیا تھا جو شہباز نے آپ کو مارنے کے لئے دیا تھا۔

وہ مجھے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کی گدی پر بیٹھنے کا خواہش مند بھی تھا، اسی لیے اس نے باپ کو ہی راستے سے ہٹا دیا۔ شہباز کی نظر میری چھوٹی اور معصوم بہنوں کے ساتھ ساتھ ہماری زمین پر بھی تھی۔ ان سب کو بچانے کے لئے مجھے اس کی رکھیل بننا پڑا۔ ہم وہاں سے کہیں بھاگ کر جا بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ ہمیں بھاگنے نہیں دیتا۔ کل اس نے مجھے بلا کر یہ زہر دیا اور کہا کہ کل رات تک اسے نادرسائیں کی موت کی خبر مل جانی چاہیے بصورت دیگر وہ میری بہنوں کے معاملے میں آزاد ہوگا۔ اسے لگا تھا کہ میں آپ کے معاملے میں اس سے دھوکہ کر رہی ہوں اور اس کے بلانے پر جان بوجھ کر اس کے پاس نہیں جاتی۔

میں ایک عرصے سے خود کو اس کے سپرد کر کے اپنی بہنوں کو اس کے غلیظ ہاتھوں سے بچاتی رہی تھی مگر اب اس نے میرے سامنے کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔ اس نے مجھے واشگاف الفاظ میں زہر دیتے ہوئے آج رات تک مہلت دی تھی۔ میں اس کی گندی ذہنیت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ وہ اپنے کبے پر عمل کرنے سے نہیں کترائے گا۔ اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں مٹھل بابا کے ہمراہ آپ کے پاس آچکی ہوں۔ لہذا اگر آج رات تک اُسے آپ کی موت کی خبر نہ ملی تو اس کے ناپاک ہاتھ میری بہنوں کی عزت کو پامال کر دیں گے مگر میں اس کے باوجود آپ کو نہ مار سکی...

سائیں... آپ نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھادیا تھا، مجھے محبت کے سچے جذبے سے روشناس کروایا تھا، اس لیے میں نے وہ زہر اپنی چائے میں ملا لیا کیونکہ میری بہنوں کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے وہ شاید میری موت کی خبر سن کر کچھ وقت کے لیے ٹل جائے اور پھر... میں نے مجبوری میں ہی سہی مگر اپنے سائیں کے ساتھ بے وفائی تو کی ہے، اس لئے اپنے لیے موت کی سزا بھی میں نے خود تجویز کی ہے۔ میں نے آپ کی زندگی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے، اپنی بہنوں کی عزت بھی۔ سنا ہے یہ دل کا درد بڑا عجیب ہوتا ہے، انسان کی زندگی جھین لیتا ہے...“ وہ یلکھت اپنا دل تھامتے ہوئے بولی۔ شاید زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا۔

ریوالور میرے ہاتھوں سے یلکھت نیچے گر گیا اور میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر صوفے پر ایک طرف لڑھکتی ہوئی مہرو کو تھام لیا۔

”مہرو... یہ تم نے کیا کر دیا...! ایک دفعہ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھ لیتی، میں سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔“

”سائیں وقت نہیں تھا۔ اگر آپ کو سب کچھ بتا بھی دیتی تو آپ آج میری بہنوں کو نہیں بچا پاتے۔ اس کے آدمیوں نے میرے گھر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہاں ان کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ بس یہی امید ہے کہ میری موت کی خبر سن کر شاید وہ درندہ کچھ دیر کے لیے ٹل جائے...“ اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

”مٹھل بابا...“ میں نے چیختے ہوئے آواز دی۔ ”مہرو! میں تمہیں اسپتال لے کر جاؤں گا... میں تمہیں اس طرح مرنے نہیں دوں گا۔“

”گوٹھ میں... کوئی اسپتال نہیں ہے سائیں... اور شہر جانے کا وقت نہیں ہے۔ ان وڈیروں نے کبھی بننے ہی نہیں دیا نہ کوئی اسکول... نہ کوئی اسپتال...“ بات کرتے ہوئے اس نے یلکھت بچکیاں بنی شروع کر دی

”مہرو تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں... مجھے ہمیشہ اس بات کا گلہ رہے گا کہ تم نے مجھے ایک بار بھی اس بارے میں اعتماد میں نہیں لیا۔“

”چھوڑو سائیں... اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ بس ایک بات یاد رکھنا! عورت بے وفا نہیں ہوتی... وہ تو بس مجبور ہوتی... ہے۔“ مہرو نے آخری بچکی لی اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اسی لمحے مٹھل بابا اور حویلی کے کچھ دوسرے ملازمین دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

(جاری ہے)

”مٹھل بابا! یہاں آپ کے اور میرے علاوہ کوئی موجود نہ رہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو باقی ملازمین فوراً ہی واپس مڑ گئے۔ ایک وڈیرا جب سخت لہجے میں بات کرتا ہے تو سب جانتے ہیں کہ اُس وقت صرف حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔

میں نے رندھی ہوئی آواز میں مٹھل بابا کو مہر وادور اپنے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ حیرت بھری نگاہوں سے مہر وکے بے جان وجود کو تکتے لگے۔

”نادر سائیں میں تو مہر و کو ایک کم ظرف عورت سمجھا تھا مگر یہ تو بڑی عظیم عورت تھی۔ اس نے آپ کو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ وادپر لگا دیا۔ میں نے اس کے بارے میں جو بھی سوچا، اس پر خدا مجھے معاف کرے۔“ مٹھل بابا بڑبڑاتے ہوئے بولے۔

”مٹھل بابا اس کی بہنوں کی عزت خطرے میں ہے، انہیں بچانے کے لیے کیا کیا جائے...! اگر شہباز کو میری موت کی اطلاع نہ ملی تو وہ اپنے کپے پر عمل کر گزرے گا۔ مہر و کی قربانی رائیگاں نہیں جانی چاہیے۔ بندے لے کر جائیں اور وہاں حملہ کر دیں۔ اس کی بہنوں اور والدہ کو اس کے چنگل سے چھڑا کر لے آئیں اور شہباز کو بھی مار ڈالیں۔“ میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

”اس طرح نہیں سائیں! میں وہاں بندے لے کر چلا بھی گیا تو اسے مارنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ بہت کشت و خون ہے گا۔ آپ جذباتی ہو کر نہ سوچیں بلکہ وڈیروں کی طرح سوچیں۔ اس نے جس مکاری سے آپ کے خلاف چال چلی ہے، آپ بھی اُسی مکاری سے اس کا جواب دیں۔ مہر و بیٹی اگر آپ کو سب بتا دیتی تو یہ معاملہ سنبھالا جاسکتا تھا مگر شاید وہ بہت ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ جب تک آپ زندہ ہیں شہباز آپ کی سالیوں کے ساتھ ایسی ولسی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس نے بس مہر و کو خالی دھمکی ہی دی تھی اور یہ پاگل لڑکی اس کی دھمکی کو حقیقت سمجھ بیٹھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی بہنوں کی عزت کو آپ کی موت کے بعد زیادہ خطرہ ہوتا۔“

”یہ جگہ مہر و سے میں نے اس کی آخری سانسوں میں بھی کیا تھا اور شاید یہ جگہ مجھے اس سے زندگی بھر رہے گا کہ اس نے ایک بار بھی مجھے اعتماد میں لینے کے قابل نہیں سمجھا مگر... جو ہونا تھا ہو چکا، مہر و مر چکی ہے مگر وہ شیطان اپنے بل میں چھپا بیٹھا ہے۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”اس چوہے کو بل سے نکالنے کا طریقہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ مٹھل بابا نے کہا۔

”کیا مطلب...“ میں نے حیرت سے پوچھا تو مٹھل بابا مجھے سمجھانے لگے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

مہر و کی موت کا غم مجھے بے حد تھا مگر انتقام کا جذبہ زیادہ شدید تھا۔ مٹھل بابا ٹھیک کہہ رہے تھے کہ مجھے اگلا قدم بہت سمجھداری سے اٹھانا ہو گا۔ مکار دشمن کو مکاری سے ہی ختم کرنا ہو گا۔ اس کی حویلی جا کر اسے مارنا مشکل تھا کیونکہ وہاں وہ محافظوں میں گھرا رہتا تھا اور پھر حویلی بھی کسی قلعے سے کم نہ تھی اور چوہے کو مارنے کے لیے بل کے اندر نہیں بل کے باہر شکنجہ لگایا جاتا ہے۔

میں نے مہر و کی لاش کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور مٹھل بابا کو انتظار کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے مہر و کے مردہ جسم کو بیڈ پر لٹا دیا اور اس کا ماتھے پر ایک بوسہ دیتے ہوئے اس کے چہرے کو تکتے لگا۔ آج کے بعد یہ چہرہ دوبارہ نظر نہ آئے گا۔ تنہائی میسر آتے ہی میرے ضبط کا بند حسن ٹوٹنے لگا مگر میں نے خود پر قابو پالیا۔ جو چال مٹھل بابا نے سمجھائی تھی، مجھے اس پر اب عمل کرنا تھا۔ یہ لے فون اٹھایا اور شہباز کا نمبر ڈائل کیا۔ چند ثانیوں تک گھنٹی کی آواز سنائی دیتی رہی اور پھر فون اٹھالیا گیا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے شہباز نے فون اٹھایا تھا۔ شاید وہ فون کے پاس اس امید پر موجود تھا کہ مہر و میری موت کی خبر سے اسے آگاہ کرنے کے لئے فون کرے گی۔

”ہیلو شہباز!“ میں نے کہا۔ میری آواز سن کر دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر اس کی آواز گونجی۔

”ارے نادر سائیں آپ...! زہے نصیب، بڑے دنوں بعد فون کیا ہے آپ نے...!“

”شہباز! غضب ہو گیا۔ میں برباد ہو گیا، میری دنیا ہی لٹ گئی۔“ میں نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کا غم سموتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا سائیں...؟“ اس نے متحسّس لہجے میں کہا۔

”تمہاری بھر جائی مہر و اب اس دنیا میں نہیں رہی شہباز۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میں اس وقت غم کی کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ تم میرے عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہو، اس لئے سب سے پہلے تمہیں یہ خبر دے رہا ہوں۔“

”مم... مہر و مر گئی...! میرا مطلب ہے کہ بھر جائی انتقال کر گئیں؟ مگر کیسے...!“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”بس کیا بتاؤں...! کچھ دیر قبل وہ اپنے میکے سے واپس آئی تھی مگر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سر کے بل زمین پر جا گری، جس کی وجہ سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور موقع پر ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس طرح کے غم سے گزر رہا ہوں۔ اس کی اس اچانک اور حادثاتی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ تم خود بتاؤ! بھلا پاؤں پھسلنے سے بھی کوئی مرتا ہے؟ میں نے اُسے نئی بار کہا تھا کہ اونچی ایڑی والی جوتی نہ پہنا کرے مگر اسے توفیشن کرنے کا شوق تھا۔“

”بڑی عجیب بات بتائی ہے نادر سائیں۔ اس طرح تو واقعی عام طور پر نہیں ہوتا مگر موت کا وقت تو مقرر ہے۔ بہت افسوس ہوا، بھر جائی کو یوں نہیں مرنا چاہیے تھا۔ بہر حال، اب گزرے وقت کو تو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ آپ نے جنازے کی تیاری کر لی ہے...! ہمارے گوٹھ میں عورتوں کی میت کو زیادہ دیر گھر میں رکھنے کا رواج نہیں ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں میں نے مٹھل بابا کو تدفین کا بندوبست کرنے کا کہہ دیا ہے۔“ میں نے بدستور غمگین لہجے میں کہا۔ مٹھل بابا نے درست کہا تھا اس چوہے کو اپنے بل سے نکالنے کے لیے مجھے بہت سوچ سمجھ کر بات کو آگے بڑھانا تھا۔ اس نے آج مہر و کو زہر دے کر مجھے مارنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ میری موت کی خبر سننے کا منتظر تھا مگر مہر و کی موت کی خبر مل رہی تھی۔ ایسے میں وہ میرے جانب سے اس شک میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ مجھے اس کی حقیقت کا کسی طرح علم ہو گیا ہے اور میں اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہوں۔ اس کے لئے یہ بات معنی خیز ہو سکتی تھی کہ جس وقت اس نے مہر و کو زہر دے کر مجھے مارنے کے لیے بھیجا، اسی دن مہر و کی موت کیوں ہو گئی۔ مجھے اُسے یہ باور کروانا تھا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

”اگر آپ کہیں تو میں ابھی آ جاتا ہوں...“ اس نے سوال کیا۔

میں اس کی مکارانہ فطرت سے اب اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اگر میں اسے فوراً آنے کا کہتا تو وہ شک میں پڑ جاتا، اس لئے میں نے دانستہ اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو شام ہونے والی ہے، تم کل تعزیت کے لیے آ جانا اور سنو! کل اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ آنا۔ آج کل کچے کے علاقے کے ڈاکو گوتھ میں آئے ہوئے ہیں، اس لئے اب تم بھی اپنے ساتھ سیکیورٹی رکھا کرو۔“

میری چال کامیاب رہی۔ اس کے تمام شکوک شبہات زائل ہو گئے۔ اس بار وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

”سائیں آپ دل چھوٹانہ کریں۔ بھر جائی کی بس اتنی ہی زندگی تھی۔ کبھی کبھی ایسے اتفاقیہ حادثات ہو جاتے ہیں۔ بہر حال میں جنازے میں شرکت کے لیے آ رہا ہوں۔“

وہ میرے دام میں آ گیا تھا مگر میں نے ایک بار پھر کہا۔ ”شہباز تم میرے بھائی ہو، اس وقت تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ ویسے بھی شام ہونے والی ہے، اندھیرا پھیلنے ہی کچے کے ڈاکو سرگرم ہو جاتے ہیں اور تم مجھے مہر و سے بھی زیادہ عزیز ہو، اس لئے کل آرام سے آ جانا۔“

”نہ سائیں نہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ وڈیرہ شہباز اپنی بھر جائی کے جنازے میں شرکت نہ کرے...! یہ گرمیوں کا موسم ہے، ابھی پانچ بجے ہیں اور سات بجے سے پہلے اندھیرا نہیں پھیلتا۔ ویسے بھی کچے کے ڈاکوؤں میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ مجھے لوٹنے کی کوشش کریں۔ میں بس ابھی نکل رہا ہوں۔ یقین کریں کہ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ مہر و کی والدہ اور بہنوں کو بھی اطلاع کرنی ہوگی۔“

”ارے تو تم کس مرض کی دوا ہو...! انہیں اطلاع کر دو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں انہیں اطلاع کر دیتا ہوں بلکہ اپنے ساتھ ہی لے کر آ رہا ہوں۔ ان کے لیے بھی یہ بڑی المناک خبر ہوگی کہ ان کی بہن اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ ویسے سائیں! مہر و سے چھوٹی بھی اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے اور اس کے نقوش بھی مہر و سے کافی ملتے ہیں۔“

شہباز کے آخری جملوں سے میرا خون کھول اٹھا۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا، میں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ مہر و کے ذریعے جو کھیل کو وہ نہیں کھیل سکا تھا اب اس کی بہن کے ذریعے آگے بڑھانے کا خواہش مند تھا۔ جس طرح مہر و اپنی بہنوں کی عزت بچانے کے لیے اس کی آلہ کار بننے پر مجبور ہو گئی تھی اس طرح شاید وہ اس کی بہن کو بھی اپنا آلہ کار بننے پر مجبور کر دیتا۔

شہباز مجھے مہر و کی بہن سے شادی کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس ازلی کمینے اور خبیث انسان کو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کس موقع پر یہ بات کر رہا ہے مگر اس وقت میں نے دانستہ اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

”کچھ وقت گزر لینے دو پھر میں تمہارے توسط سے مہر و کی ماں سے ایک بار پھر بات کروں گا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس کی چھوٹی بہن کے نقوش مہر و سے کافی ملتے ہیں۔ اس کو بھلانے کے لیے میرے پاس کوئی تو سہارا ہونا چاہیے۔“

میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہوئی نامردوں والی بات...!“ شہباز پر جوش لہجے میں بولا۔ ”اس بار بھی وہ آپ کو انکار نہیں کریں گے، میں مکمل ذمہ داری لیتا ہوں۔ بہر حال ابھی مہر و بھر جائی کی تدفین ہو جائے پھر کچھ عرصے بعد اس بارے میں بات کریں گے۔“

میں اس کی والدہ اور بہنوں کو لے کر پہنچ رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون کریڈل پر رکھا اور ابدی نیند سوئی مہر و پر ایک نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے نکل کر مٹھل بابا کے پاس آ گیا۔

”چوہا اپنے بل سے نکل کر اس طرف آ رہا ہے مگر اس کے ساتھ مہر و کی والدہ اور بہنیں بھی ہوں گی۔“

”آپ بے فکر رہیں چھوٹے سائیں! میرے نشانے سے تو آپ بھی واقف ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رائفل کی دوسرے گولی نہیں چلاؤں گا اور مہر و کی والدہ اور بہنوں کو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ میں جارہا ہوں۔ مجھے اب راستے میں ناکہ لگا کر بیٹھنا ہے۔“ یہ کہہ کر مٹھل بابا واپس مڑ گئے۔

شہباز کے گوٹھ سے ہمارے گوٹھ آنے کے کئی راستے تھے مگر میری حویلی آنے کے لیے چھ سات کلومیٹر کا ایک ہی پکارا راستہ تھا۔ شہباز کو وہی راستہ اختیار کرنا تھا، جہاں کسی اسپید بریکر کے پاس مٹھل بابا اپنی رائفل کے ہمراہ اس کے منتظر ہوتے۔ میں نے بچپن میں مٹھل بابا سے ہی اسلحہ چلانا سیکھا تھا اور ان کی نشانہ بازی کی مہارت سے بخوبی آگاہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شہباز کے ناپاک قدم اس حویلی میں نہیں پڑنے دیں گے اور مہر و کی والدہ اور اس کی بہنوں کو بھی کچھ نہیں ہونے دیں گے۔

سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ شاید شہباز جیسے گھناؤنے انسان کے معاملے میں قسمت بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔

شہباز جیسے ہی مطلوبہ سڑک پر اپنی گاڑی کے ساتھ نمودار ہوا اور ایک اسپید بریکر پر اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی، مٹھل بابا کی چلائی ہوئی گولی اس کی کھپڑی کے پار ہو گئی۔ گاڑی کی رفتار بہت سست تھی اس لیے وہ جھٹکا کھا کر رک گئی۔ مہر و کی والدہ اور بہنیں زخمی ہونے سے محفوظ رہیں۔ مٹھل بابا نے انہیں اپنے ساتھ دوسری گاڑی میں بٹھایا اور حویلی لے آئے۔

شہباز کے قتل کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ پولیس نے اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے قبضے میں لے لیا۔ ایس پی سراج خان کو مجھ پر شک تھا، تاہم اس نے مہر و کی تدفین کے دوران مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مہر و کو ہمارے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ گوٹھ کی مالکن کی موت ہوئی تھی اس لیے جنازے میں پورا گوٹھ امنڈ آتا تھا۔

ایس پی سراج خان کو اگرچہ مجھ پر اور مٹھل بابا پر شک تھا مگر اسے کوئی چشم دید گواہ نہ مل سکا اس لیے شہباز کے قتل کا مقدمہ بھی کچے کے ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کو سپرد خاک بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔ شہباز کے موت کے بعد اس کی ساری جائیداد مجھے مل گئی مگر میں نے اس کی ساری جائیداد اور زمین اس کے گوٹھ کے لوگوں میں تقسیم کر دی اور اس کی حویلی کو اسکول کے لیے مختص کر دیا۔

مہر و نے میری خاطر موت کو گلے لگایا تھا، اب میرا بھی فرض تھا کہ میں اس کی بہنوں کے لیے وہ سب کچھ کرتا جس کی وہ متمنی تھی۔ میں نے اس کی بہنوں کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے اچھے خاندانوں میں کروائیں اور انہیں زندگی کی ہر آسائش دی۔ اس کی بہنیں مجھے اپنا سب کچھ سمجھتی ہیں اور کبھی کبھی اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ مجھ سے ملنے بھی آ جاتی ہیں۔

اس واقعے کو آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ مٹھل بابا مجھے شادی کرنے کا کہتے ہیں مگر میں ان کی بات ہمیشہ ٹال جاتا ہوں۔

مہر و کی یاد میرے دل میں کچھ اس طرح سے بسی ہے کہ کسی اور کی گنجائش ہی نہیں۔ اپنی مثبت سوچ کے تحت، میں نے دشمنی کی جس لکیر کو مٹانے کی کوشش کی، اس نے میری مہر و کو مجھ سے چھین لیا۔ میرے ذہن میں آج بھی اس کے وہ جملے گونجتے ہیں، جو اس نے مرتے وقت مجھ سے کہے تھے کہ ”سائیں! عورت بے وفا نہیں ہوتی، وہ تو بس مجبور ہوتی ہے۔“

(ختم شد)